عبدالعزیز خالد

کراچی

۳۰/۷/۶۵

دُکانِ شیشہ گر

بیدلؔ از کلفتِ شکست منال
بزمِ ہستی دُکانِ شیشہ گر است

بیدلؔ

یہ کارگاہ ساری دوکانِ شیشہ گر ہے
آنکھوں میں لختِ دل ہے یا پارۂ جگر ہے

میرؔ

آہستہ سے چل میانِ کہسار
ہر سنگ دُکانِ شیشہ گر ہے

دردؔ

غافل قدم کو اپنے رکھیو سنبھال کر یاں
ہر سنگ رہ گزر کا دوکانِ شیشہ گر ہے

قائمؔ

دکانِ شیشہ گر

گوشہ ڈاکٹر خرش صدیقی

عبدالعزیز خالد

مصنّف عبدالعزیز خالدؔ

ناشر بک لینڈ۔ کراچی

باہتمام شیخ محمّد حسین

بار اوّل جون ۱۹۶۱ء

بار دوم جون ۱۹۶۵ء

کتابت ابنِ رفیق

طابع پروسیس پاکستان وکٹوریہ روڈ کراچی

قیمت

۵ روپے

بُک لینڈ

۱۲۔ محمّد بلڈنگ، بندر روڈ، کراچی ۱

فون ۲۳۶۱۰۹

فہرس

مستفاد

مبر گمانِ توارد یقیں شناس کہ دُزد
متاعِ من زنہاں خانۂ ازل برداست!

حریرِ رگِ گُل

یک شکر خندہ از لبِ شیریں
خوں بہائے ہزار فرہاد است

پنڈورا ——————— ہیفاسطس
پرومے تھیئس ——————— اپی مے تھیئس
ھرمس ——————— زیئس

پرومے تھیس نسلِ انسانی کا اوّلین معلّم و محسن۔ طیطان، یوری میدون یا آئے پطیس اور پری کلائمینا یا ایشیا کا بیٹا تھا۔

اپی مے تھیس، اطلس اور مینو طیس اس کے بھائی تھے۔ طیطان —— (سورج بنسی) وہ دیو پیکر مخلوق تھی جو تخلیقِ آدم سے پہلے دنیا میں بستی تھی۔ کوہ وقار اطلس سب سے بڑا۔ سمندروں کے نشیب و فراز کا واقف، اور سرزمینِ اطلانطس کا فرماں روا تھا۔ مغلوب الغضب اور متلوّن مزاج دیوتاؤں نے ایک دن ترنگ میں آ کر، طوفان بھیج کر پورے علاقے کو تباہ و برباد کر دیا۔ اطلس اور مینو طیئس بچ نکلے اور کرونس اور سورج بنسیوں کے ہم رکاب خدایگانِ اولمپس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ زیوس نے مینو طیئس کو تو رعد سے ہلاک کر دیا۔ اور اطلس (حمّال۔ الاہ حمیل کرۃ الارضیتہ) کو ابدالآباد کے لئے آسمان برداری کی خدمت پر مامور کر دیا۔

پرومے تھیئس، اطلس سے زیادہ معاملہ فہم اور عاقبت اندیش تھا۔ اس نے اس گیر و دار میں زیوس کا ساتھ دیا۔ اور اپی مے تھیئس کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا دونوں کو اس کارگزاری کے صلے میں یہ منصب جلیل سپرد ہوا۔ کہ وہ انسان اور دیگر

حیوانات کو وہ آلات و ملکات عطا کریں جو تحفظِ ذات اور تنازع للبقا کے لئے ضروری ہیں۔

پرومے تھیئس سورج بنسی خاندان کا فرزانہ ترین فرد تھا۔ اُس نے درپردہ اثینا سے معماری، ستارہ شناسی۔ جہاز رانی اور علم طب و ہندسہ سیکھ کر ظلوم و جہول انسان کو ان سے روشناس کرایا۔ لیکن زیوس جو بوجوہ نوع انسانی کا قلع قمع کر دینے پر تُلا ہوُا تھا۔ اور اب تک محض پرومے تھیئس کی آہ و زاری کی وجہ سے خاموش تھا۔ انسان کی روز افزوں علمی و عملی فتوحات کو دیکھ کر غضب ناک ہو گیا۔ اور اس نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس لطیفۂ خاکی کو یک سر آگ سے محروم رکھنے کا فیصلہ کیا۔

پرومے تھیئس یہ اطلاع پاتے ہی اثینا کے پاس پہنچا۔ اور عقبی سیڑھیوں سے اولمپس پر داخلے کی اجازت چاہی۔ اثینا کو بھلا کیا عذر ہوتا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے سُورج دیوتا کی اگنی رتھ سے مشعل روشن کی۔ اور دہکتے ہوئے کوئلے کے ایک ٹکڑے کو سویا کے ڈنٹھل (ساق بادیاں) کے گودے دار جوف میں چھپالیا۔ اور مشعل کو روشن کر کے چوری چوری وہاں سے کھسک آیا۔ اور آتے ہی وہ آگ حضرت انساں کے حوالے کر دی۔

زیوس نے آگ بگولا ہو کر انتقام لینے کی ٹھانی۔ اور جوشِ غضب میں ہیفاسٹس کو لجبتی ہوئی خشک مٹی (من صلصال کالفخار) کی ایک عورت بنانے، ریاحِ اربع کو اس میں جان ڈالنے اور حورانِ اولمپس کو اسے عروسانہ ناز و ادا بخشنے کا حکم دیا۔

یہ بتِ ساختہ پرداختہ جس کا نام پنڈورا رکھا گیا حسن و جمال میں اپنی نظیر آپ تھا۔ زیوس نے ہرمس کے ہمراہ اسے اپی مے تھیئس کے پاس بطورِ تحفہ روانہ کیا۔ لیکن اپی مے تھیئس

نے اپنے بھائی کی تہدید و ترغیب کے زیر اثر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر تو زیوس کی آتشِ غضب اور بھی بھڑک اٹھی۔ اور اس نے کوہ کاکیشیا کے ایک مینار سے پرومے تھیئس کو ننگے بدن زنجیروں سے جکڑوا دیا۔ جہاں ایک مرگھٹ کا عقاب سارا دن لگاتار اس کے جگر کو نوچتا کھسوٹتا۔ یہ دردناک عذاب کبھی کم نہ ہوتا کیونکہ رات کو جگر پھر ثابت و سالم بن جاتا۔ زیوس نے چہ میگوئیوں کو روکنے اور اس منتقمانہ کارروائی پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ مشہور کر دیا کہ پرومے تھیئس ایتھنا پر مائل تھا۔ اور کام جوئی کے لئے اولمپس پر دُزدیدہ داخل ہوا تھا۔ بر وقت پکڑا گیا اور اب اسے شوقِ فضول اور جرأتِ رندانہ کی سزا مل رہی ہے تاکہ دوسرے عشق بازوں کو عبرت ہو۔

ایپی مے تھیئس اپنے دھرماتما بھائی کا یہ المناک انجام دیکھ کر فوراً پنڈورا سے مناکحت پر رضامند ہوگیا۔ پنڈورا جتنی بدیع الجمال تھی اتنی ہی بدمزاج، خودپسند، بے وقوف اور لذت پرست تھی۔ اس نے آتے ہی اس مرتبان کا ڈھکنا کھول دیا، جسے پرومے تھیئس نے اس تاکید کے ساتھ ایپی مے تھیئس کے حوالے کیا تھا کہ زنہار زنہار اس کا مُنہ نہ کھولنا۔ نہیں تو دُنیا میں قیامت برپا ہوجائے گی۔ طلسماتی مرتبان میں بڑھاپا، بیماری محنت، مشقت، دیوانگی، فسق و فجور۔ یعنی سب دنیوی آلام و مصائب مقیّد تھے ڈھکنا کھلتے ہی دَل کا دل مرتبان سے اُٹھا اور چاروں اُور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ بد بلاؤں نے ایپی مے تھیئس اور پنڈورا کے روئیں روئیں میں کاٹ کھایا۔ اور پھر بے رحم قزاقوں کی طرح بنی آدم کے درپے ہوگئیں۔

فریب آرزو ۔۔۔ افسونِ انتظار تمنّا کہیں جسے، جسے پرومے تھیئس نے دُوسری آفات کے ساتھ ہی بند کر رکھا تھا بچی رہی۔ تاکہ وہ مایوس و غمزدہ انسان کی سنہرے خوابوں

اور طلوعِ صبحِ فردا کی خوش نما امیدوں سے مسلسل ڈھارس بندھاتی رہے اور زندگی کے بوجھ کو ناقابلِ برداشت نہ بننے دے۔

مظلوم پرومی تھیئس شاعروں کا محبوب موضوع رہا ہے۔ وہ خلوص و ایثار کا ایک جلیل و جمیل مظہر ہے۔ جس نے اذیت ناک مزاحمت کے باوجود، بشر کو تہذیب و تمدن کی برکت علوم و فنون کی سعادت اور خودشناسی کا نسخۂ کیمیا عطا کیا۔ وہ کسی وقت بھی اس قہار و جبار دیوِ استبداد کے سامنے خم ہو کر رستگاری حاصل کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے وہ اسمِ اعظم معلوم تھا جس سے زیوس کے تخت کا استحکام و استمرار وابستہ تھا۔ وہ اس کے انکشاف سے زیوس کی ابدی خوشنودی حاصل کر سکتا تھا۔ اور اس کا مقرب و محبوب بن سکتا تھا۔ لیکن اس کی جسوری و عیوری نے اس بزدلانہ مصالحت کو جائز نہ رکھا۔ اس استقامت نے اُسے عظمت عطا کی اور حلم و برداشت کا صبر و عزیمت کا اور ظلم و تشدد کے خلاف سرفروشانہ نبرد آزمائی کا عظیم الشان سمبل بنا دیا۔

(۱)

(ہیفاسطس کی کارگاہ)

ہیفاسطس :- (پنڈورا کے مجسمے کے سامنے)

حسنِ تخلیق کا اعجاز ہے یہ پیکرِ گل
مرے افکار کا آہو کہ تھا آوارہ خرام
تہِ گرداب کہیں قلزمِ بینائی میں
کتنی مشکل سے ہوا دامِ نظارہ میں اسیر
سالہا سال کی مہجور و حزیں جاں کا ہی
آج نیرنگیٔ قدرت سے مجسّم ہو کر
دل رُبایانہ مرے سامنے اِستادہ ہے
طینِ لازب کا یہ رتنار، دمکتا پیکر
میری تصویر گری، میری قلمکاری ہے؟
یہ نہ سونے سے بنا تختِ حرا کی مانند
نہ ہی رعدِ شرر افشاں کی طرح آہن سے

نرم مٹّی سے جو چھونے سے لچک جاتی ہے
میرے ہاتھوں نے اُبھارا ہے محبّت کا وہ نقش
خوب تر حسُن کی دیوی بھی نہ ہو گی جس سے
نیلگوں بحر سے جس وقت اُٹھا کر لائیں
مورچھل جھلتی ہوئی بسترِ برگِ گلُ پر
پئے عرض اس کو اولمپس پہ ریاحِ اربع
پیرہن آبِ رواں کا صفتِ لکۂ ابر
جگمگاتے ہوئے رُخ پر اثرِ بحر و شعاع
شرمسار اس کے تنِ نازک و بلّوریں سے
ریشم و پنبہ و سنجاب و سمور و قاقم
ایسا جادو تو کبھی سانچے میں ڈھالا نہ گیا
کیسا جادُو ہے کہ مسحُور ہے جادُو گر بھی!

زیوس:۔ کیا ترے کام کی تکمیل ہوئی ؟

ہیفاسطس:۔ ایزد پاک!

زیوس:۔ ہے ترا ساز مگر تشنۂ آہنگ ابھی
رُوح کا سرِ نہاں تجھ پہ عیاں ہو نہ سکا

راز منت کشِ اظہار و بیاں ہو نہ سکا
کس طرح کُن کی پرُ اسرار صدا کرتی ہے
ایک قطرے کو گہرُ، ایک لطیفے کو بشر
میں نہ چاہوں تو یہ پتھر کے نگاریں پیکر
آشنا ہو نہ سکیں لذّتِ پیدائی سے
چمنِ دہر کے آیٔنِ خود آرائی سے
مسلکِ یوسفی و وضعِ زلیخائی سے
جب تک اس کو میں شناسائے تکلّم نہ کروں
اس کو ایّام کی بے تابئ جاوید نہ دُوں
نامکمّل ہی رہے گا یہ نقش
ترے گلگار خیالات کا عکس!

ہیفاسطس:- یہ بھی پائے گا حیاتِ ابدی؟

زیوس:- جسم فانی ہے کہ ہے مظہرِ خاک
مرے انفاس سے وابستہ ہے سر رشتۂ رُوح
اپنے خالق کی طرح رُوح بھی لافانی ہے
رازِ سربستہ کے عرفان سے غمناک نہ ہو
اس کے انداز کو بخشیں گے وہ سرمستئ ناز

جب اُٹھے زمزمہ پرداز و فسوں ساز اُٹھے
غیرتِ ماہ دو ہفتہ یہ عروسِ شنگول
ہنس کی چال چلے مور کو شرمندہ کرے
نرگسی آنکھ نمولوں سے لڑے جس پہ پڑے سحر کرے
دمِ گفتار و تبسم کھلیں کچنار پہ پھول

(ہوا کا تیز جھونکا)

ہیفاسطس:۔ معجزہ تھا کہ ہوا کا جھونکا
درو دیوار نوا سنج ہوئے
نیم وا ہونٹ ہلے ہولے سے
کتنا دل کش ہے بم و زیرِ نفس
لب جو نے کوئی لچکے جیسے
ہونٹ گلنار، گلابی چہرہ
قامتِ ناز کو جنبش دے کر
آس پاس اُس نے نظر دوڑائی
اُس کی آنکھوں میں ہے دُنیائے تحیّر آباد
چشم و لب ہیں کہ ایاغِ حیرت
موجِ خوں سے لب و رُخسار پہ سُرخی دوڑی
رگِ افسردہ سے احساس کے شعلے پھوٹے

رُوح کے جوہر خوابیدہ نے لی انگڑائی
اور یہ پیکرِ گِل زندہ و بیدار ہُوا!
سعی مشکور ہوئی جہد ثمر لے آئی!

(پنڈورا پائیدان سے نیچے اُتر آتی ہے)

(۲)

(اولمپس)

ہرمس:- (اپنے نعل، پہنتے ہوئے)

غمِ ایام سے یک لحظہ فراغت نہ ملی
ایک آزار ہے واقع میں جہاں گردی بھی!
کوئی پل چین نہیں، جان عجب ضیق میں ہے
آج جس کام کی تکمیل کو میں نکلا ہوں
وہ مگر ہے طرب انگیز خلافِ معمول
طارمِ عرش سے پیغام ملا ہے مجھ کو
جس جگہ رہتا ہے مظلوم پرومے تھی اس
ایک دوشیزۂ نورس کو وہاں لے جاؤں
تا کہ وہ حسنِ جواں سال کی رعنائی سے

اس کے اُجڑے ہوئے گلزار کو آباد کرے
اور افکارِ کم و بیش سے کر کے آزاد
اسے مرہونِ خمارِ مئے دو شینہ کرے
خلوتِ شب میں بچھائے گل و لالہ کی بساط
صبح دم پیش کرے طشتِ طلائی میں صبوح
غمِ ایام کو دونوں یونہی بہلاتے رہیں
یونہی منظر گہِ آفاق کو مہکاتے رہیں
آج میں دوشِ صبا پر رقصاں
ایک مظلوم کی دلداری کو
برق وَش نغمہ سرا عطر فشاں جاتا ہوں!

(۳)

(کوہِ قاف پر بینارہٗ پرومے تھیئس)

پرومے تھیئس:- نیلگوں بحرِ شفق پوش کی پہنائی میں
چھلکی بینائے سحر، کشتیٔ مہ ڈوب گئی
کہکشاں ماند ہوئی۔ قرمزی موجیں اُبھریں
رات بھر ذہن میں افکارِ پریشاں کا ہجُوم
کسی آئندہ مصیبت کی خبر دیتا تھا
مطلعِ خوُر سے اُبھرتے ہوئے خم دار خطوُط
آج شاید نئے آلام کا مُژدہ لائیں
قہرِ مانانِ فلک کی ستم آرائی سے
کب تک موردِ آلام رہے گا احساس؟

(ہرمس اور پنڈورا دہلیز پر)

پنڈورا:- غیر مرئی کوئی شے ہے جو مجھے روکتی ہے
ایک محبوس فغاں، ایک گلوگیر نوا
ایک ناشاد، پُراسرار، حزیں خاموشی
در و دیوار سے ٹکرا کے پلٹ آتی ہے
اور یہ رُوحِ دفا۔ خستہ۔ شکستہ۔ دلگیر
حُزنِ مجبور کی اِک ساکت و جامد تصویر
کتنی ویران ہے یہ انجمنِ تنہائی!
میں تو اس کُلبۂ احزاں میں نہیں جا سکتی

ہرمس:- آؤ تسلیم، پرومے تھی اس!

پرومے تھی اس:- کون؟

ہرمس:- میں ہُوں مجھے کیا بھُول گئے؟

پرومےتھیس:- تو جو چوروں کا ہے سرخیل، سفیرِ فلکی
میرے مسکن میں تجھے کونسی حاجت لائی
کیا کوئی چیز چُرانے کے لئے آئے ہو؟

ہرمس :- ترا دامن بھی تو آلودہ ہے
تو نے بھی آگ کی چوری کی تھی

پرومیتھیئس :- منہ اندھیرے ہوئی کیا ایسی ضرورت لاحق؟

ہرمس :- خالقِ وقت اسیرِ سحر و شام نہیں
ربّ الارباب نے بھیجا ہے مجھے تیری طرف

پرومیتھیئس :- کس لئے ؟

ہرمس :- عیش و طرب کا سر و ساماں دے کر

پرومیتھیئس :- دیوتاؤں سے نہیں کوئی عقیدت مجھ کو
اُن کے تختوں سے مجھے خون کی بُو آتی ہے

ہرمس :- تو مگر عاشقِ حبس و کُتک و تبعیدی ؟
دائما کسوتِ ماتم میں ، غمیں جاویداں
سوچ یہ مرمر و مرجاں کا حریری پیکر
صبحِ دم اوس میں بھیگا ہوا برگِ گلِ تر

رنگ و بُو میں سمن و سنبل و ریحاں سے دوچند
کبھی دے سکتا ہے تجھ کو کوئی آسیب و گزند؟

پرومے تھیس:۔ دیوتاؤں سے مراجب کوئی یارانہ نہیں
کس تعلّق سے قبول ان کے تحائف کر لوں
لاکھ الطافِ گرانمایہ ہوں دامن کشِ دل
فقرِ خود دار نہیں خوگرِ تسلیم و رضا
کون ہے تو ؟

پنڈورا:۔ میں تجھے جانتی ہوں تو گرچہ
مجھ سے ناواقف و آزردہ و برگشتہ ہے

پرومے تھیس:۔ کس طرح ہے تو شناسا میری؟

پنڈورا:۔ تو ہی تھا محفلِ آفاق کا مشعل بردار
روشنی بخشِ ولایات و دیار و امصار

پرومے تھیس:۔ میرا طالع تو خلاؤں میں کہیں ڈوب گیا
وہ بھی احسان فراموش ہی نکلے آخر

دیوتاؤں سے تو پہلے کوئی اُمّید نہ تھی
جب گھٹا ٹوپ اندھیروں نے طرب گاہوں کے
رقص کو آہنی حلقوں میں جکڑ رکھا تھا
میں نے ہی حضرتِ انساں پہ ضیا پاشی کی
اس کے ظُلمت کدۂ غم میں بکھیرے انوار
دشت و صحرا کے حسینوں کی حنا بندی کی
وادی و کوہ میں مہتاب بکھیرے میں نے
لیکن اس سعی سے آخر مرا لہنا کیا تھا؟
یہ گلوگیر خموشی یہ عذابِ جاوید
نہ تلطّف ، نہ مدارا ، نہ نوازش ، نہ نوید!

ہرمس:- اُن کا پیمانِ وفا ، اُن کا خلوصِ نیّت
صفتِ جوہرِ آئینہ ہے آپ اپنی دلیل
اور یہ شاہدِ گُل چہرہ ضمانت اس کی
اس پری وش کی طرحداریٔ ریعانِ شباب
صحنِ گلشن میں سہی سروِ خراماں جیسے
ترے تاریک نوا خانے کو مہکائے گی
چھَب تجھے حسُنِ گلو سوز کی دکھلائے گی
نِت نئی عشوہ گری سے تجھے بہلائے گی

پرومے تھئیس:۔ دیوتاؤں کی عنایات سے مستغنی ہوں
مجھے حاجت نہیں اس نکہت وضو پاشی کی
دلِ پُرخوں نہیں پہلو میں جوالا مکھ ہے
جس سے میں کسبِ ضیا کرتا ہوں
مرے خلاق تخیل کی فسوں کاری سے
خود مرے ذہن کا کاشانہ پری خانہ ہے
مرے افکار، مرے عزم، مرے اندیشے
ہیں مرے گوشۂ عزلت کے رفیق و دمساز

ہرمس:۔ میری مانو تو نہ بیکار جھمیلوں میں پڑو
رُوپ رس نوش کرو، غم کو فراموش کرو!
لِم نکالو نہ کوئی فیصلہ کرو اس میں تلاش
سوچ لو پھر کفِ افسوس نہ ملتے رہ جاؤ
کہ خداوندوں کے انعام کو ٹھکراتے ہو
التجائیں نہیں کرتے کبھی اورنگ نشیں
اُن کے الطافِ فراواں تو عطا کرتے ہیں
اور جو انکار کرے کور نصیبی اس کی

پرومے تھئیس:۔ دیوتاؤں کی کوئی شے کسی صورت میں بھی ہو

موجۂ رنگ کہ ناظورۂ رعنائے بہار
بے تکلّف اُسے ٹھکرا دوں گا
جاؤ!

پنڈورا:۔ میں اس جگہ اک لحظہ بھی
اب کسی طور نہیں رُک سکتی

ہرمس:۔ تم کو یہ خواب مبارک ہوں، ہیولوں کے غبار
نامرادانہ خیالات کے سُنسان دیار
نہ کہیں لحنِ مغنّی نہ کہیں صوتِ ہزار
نفخۂ حسن کی بو باس سے بے گانہ مشام
لذتِ حرف و حکایات سے محروم ایّام!

(۴)

فضا

(اولمپس کو لوٹتے ہوئے)

ہرمس:- اپنے مینار کے مانند خموش و تنہا
سرد مضبوط چٹانوں کی صلابت کی طرح
کافرانہ متمکّن ہے یہ مردِ بے باک
جس کو اب حق کی مہابت ہی ہلا سکتی ہے
بطنِ ایتھر سے گذرتا ہوا مانندِ سناں
میں سوئے چرخِ بریں بال فشاں جاتا ہوں
اے خوشا عیدِ تماشا! زہے طغیانِ نشاط!
یہ طراوت گل و غنچہ کی یہ امواجِ نسیم
یہ خلا تاب و سُبک سیر شعاعِ خورشید
میرے ہی زیرِ تصرّف ہے یہ اقلیم فضا
جس جگہ آٹھ پہر سرگرم سفر رہتا ہوں!

(۵)

(اپی میتھیئس کا مکان)

اپی میتھیئس:۔ آدمی ہے کہ پری زاد کہ بنتِ مہتاب
ہونٹ شنجرف کہ بیجادہ و گلنار و گلاب!
چاکِ محرم سے نمودار خُمِ نابِ شباب
جٹی جٹی ہیں بھویں، نین کٹیلے کجرار
ادھ کھلے ادھ مندے رس ریت بھرے نیندارے
آنگ میں انگ ہے یا میان سے باہر تلوار
کس نے کنچن ہیں بھرا اینچ کے کٹ کا کنچن
شاخِ زرّیں ہے ترا نام کہ انگور کی بیل
اے سکو چیلی للت، مدھ بھری البیلی نار!
تجھے ریحانہ پکاروں کہ کہوں مرجانہ

قدِ رعنا پہ ترے ذوقِ نظر ناز کرے
سرو و شمشاد و سمن کو نظر انداز کرے
حیرت و حسرت و اُمّید کا در باز کرے
کیوں فضاؤں میں ہو آوارہ یہیں رہ جاؤ

پنڈورا:۔ میں تو اِک پیکرِ آب و گِل ہُوں

اپی میتھیئس:۔ ترے بے ساختہ جلوؤں میں طلسماتِ شہود
ایک مدہوش لطافت ترا سرجوش وجود
بولے خُوبانِ جہاں گوئے ملاحت کہ ربود؟

پنڈورا:۔ سب ترے حُسنِ نظر کا پرتو
تو مرے حُسن سے پہلی ہی نظر میں بے کل
صفت دانۂ اسپند ہُوا
اور معلُوم نہیں تجھ کو مرا نام و نسب

اپی میتھیئس:۔ میں تو پہچانتا ہوں صبحِ ازل سے تجھ کو
اور دیرانۂ ایّام میں سرگرداں تھا
تیرے انوارِ گریزاں کو پکڑنے کے لئے

میری کاوش نے تجھے پا ہی لیا آخر کار
کتنی مدّت سے میں آشفتہ تھا

پنڈورا:۔ یہ مکاں کس قدر آسودہ و خوش منظر ہے
دے رہے ہیں در و دیوار سکوں کا پیغام

اپی میتھیئس:۔ یہ در و بام تجھے کہتے ہیں اہلاً سہلاً
یہ شبستاں بھی ترا اس کا مکیں بھی دونوں

پنڈورا:۔ جی میں آتا ہے یہیں عمرِ رواں کٹ جائے
کوئی جادُو ہے کیا جس نے مجھے بیخود و مست

اپی میتھیئس:۔ اے پدم لوچنی گنج گامنی متوالی نار
وہی افسوں جو خراماں ہیں ترے مدھو بن میں
ان کی مستی سے ہیں مخمور یہ کاخ و ایواں
اے بُتِ نادرہ فن! اے صنمِ شعلہ جمال
تیری زُلفوں میں ہیں سرگشتہ غزالانِ خیال!

پنڈورا:۔ یہ دلآویزئ منظر! یہ سوادِ دل کش!

اسی فردوس میں تا عمر مجھے رہنے دو
آئنہ کار درِ و بام کی مینا کاری
کیا کسی گنجِ گراں مایہ کی ہے محرمِ راز؟
دُور کونے میں جو افروزاں ہے
وہ طلا کار منقّش صندوق
اس میں کیا تم نے چھپا رکھّا ہے
بند ہیں نیلم و الماس و گہر
یا نہاں اور کوئی قیمتی راز؟

اپی میتھیئس:۔ اس میں مستور ہے کیا خود مجھے معلوم نہیں

پنڈورا:۔ کبھی دیکھا نہیں سرپوش اُٹھا کر تم نے

اپی میتھیئس:۔ اس سے مانع ہے مجھے ہاتفِ غیب
دیوتاؤں کے ہیں وہ راز مقفّل اس میں
چشمِ انساں سے رہیں گے جو ہمیشہ پنہاں
تم ان اسرار کے کیوں در پے ہو
دیوتاؤں نے رکھے مصلحتاً جو مخفی
جب بھی منظورِ مشیّت ہو اُٹھا دیں گے نقاب

چھوڑو اس راز کو آؤ کہیں گلگشت کریں
ناز فرما کمر کوہ میں ہے شاہدِ گلُ
اور نغمات سے لبریز ہے لحنِ بُلبل
کیوں نہ ہم بھی غمِ الفت کے فسانے چھیڑیں
نشہ برساتی ہے مینا کی صدائے قلقل
اسی مدہوش طرب ناک فضا میں ہم بھی
کیوں نہ پھر حُسن و محبّت کے ترانے چھیڑیں
ہم بھی گائیں۔ لب و رُخسار بھی سرگوشی کریں
آؤ رندانہ خرابات میں مے نوشی کریں!

پرومے تھیس:۔ (باہر سے)
ارے کمبخت کہاں ہو بولو ؟

اپی میتھیس:۔ میرے بھائی نے پکارا مجھ کو !
ہائے بیدرد کو کس وقت مری یاد آئی

پنڈورا:۔ دیکھ کر مجھ کو یہاں ہو نہ تکدّر اس کو
(درختوں میں چھُپ جاتی ہے)

پرومیتھیئس:۔ (داخل ہوتے ہوئے)

کس سے تم محوِ تکلّم تھے ابھی؟

دوڑ کر کون درختوں میں چھپا؟

اپی میتھیئس:۔ مری خلوت کی امیں، پینڈورا!

پرومیتھیئس:۔ رائیگاں ہی گئے سب پند و نصائح میرے

حُسن کے پردے میں ہے یہ وہ فسوں کار بلا

جس کے کاٹے کا جہاں میں کوئی منتر ہی نہیں

ہے ابھی وقت سنبھل جانے کا

اپی میتھیئس:۔ دیوتاؤں سے عقیدت ہو جنہیں

اُن کے مہمانوں کی کیونکر نہ وہ تکریم کریں

پرومیتھیئس:۔ دیوتاؤں کا غضب ہو جن پر

پہلے ہوتے ہیں وہ احساسِ زیاں سے محروم

اپی میتھیئس:۔ ان کے اس تحفے کو میں ٹھکرا دوں؟

پرومے تھئیس:- جب کوئی تحفہ بھی آئے ملاءِ اعلیٰ سے
پائے ہمت سے اُسے ٹھکرا دو
نہ کوئی روگ بسا ہو نہ چلو بینڈی چال
کہ یہ ناہید نغم، زہرہ نگہ، مشکیں خال
سربسر پاؤں کی زنجیر ہیں جی کا جنجال

اپی میتھئیس:- کون ٹھکرائے بھلا ایسے حسیں تحفے کو؟

پرومے تھئیس:- بنتِ حوّا کی فسوں کاری ہے وہ دامِ بلا
جس میں اُلجھے تو نکلنا معلوم؟
کہ یہ افیون ہے تریاق نہیں!
غالیہ سا خمِ گیسو کی کمندِ مشکیں
آہوئے دل کے لئے حلقۂ فتراک بھی ہے
آؤ اُٹھو مرے ہمراہ وہاں دُور چلو
جس جگہ قاف کے بینار پہ ہے برف کا تاج
نوعِ انساں کے لئے میری نگاپو دیکھو
اس مشقت کو مسرت کا خزینہ سمجھو
تم بھی بن جاؤ زبان دانِ نجوم
کشتیاں کھیتے ہوئے رات کی تنہائی میں

ایک گنجینۂ اسرار ہیں شب زندہ دار
تم بھی باتیں کرو افلاک کے دربانوں سے
اور بیتیں سنو شب گیر حدی خوانوں سے

اپی میتھیس:۔ آپ میں جذب ہوا باپ کا زور و قوّت
ملا ورثے میں مجھے ماں کا گداز و شفقت

پرومی تھیس:۔ اپنے منصب کو پسِ پشت نہ ڈالو، اُٹھو
صنفِ نازک کے خیالوں کو مٹا دو دل سے
عیش کوشی سے، تن آسانی سے
دلِ ناداں کی غلامی سے نکل کر دیکھو
کلۂ ابر کی عظمت سرِ کہسارِ بلند
ترے خوابیدہ ارادوں کو بلاتی ہے، سُن!
ترا قد بھی کلۂ ابر کو چھو سکتا ہے

اپی میتھیس:۔ آبشاروں کی پُر اسرار سُبک رَو لہریں
جنگلی پھولوں کی خوشبو سے گراں بار ہوا
کسی انجان سمن پوش جزیرے کا پیام
دیدۂ و دل کو سناتی ہیں بصد ناز و ادا

پرومیتھیئس:- ان کے پیغام پہ لبّیک کہو!

اپی میتھیئس:- آپ کے سامنے اِک طفلکِ ناداں ہوں میں
آج سے آپ کو پھر راہ نما مان لیا!

(۶)

(اپی میتھیس کا مکان)

پنڈورا:- میں یہاں موجِ صبا کی طرح آوارہ ہُوں
اس شبستاں سے کہیں بڑھ کے بھی ایواں ہوں گے
لُطف یہ ہے کہ یہاں میری جہانگیری ہے
لیکن اس کمرے میں کیا جادُو ہے
در و دیوار مرصّع ہیں چھتیں مینا کار
اور اس کونے میں وہ ایک منقّش صندوق
اس میں کیا راز ہے کھلتا ہی نہیں
جی میں آتا ہے اسے کھول ہی لُوں
لیکن احکامِ سروشِ غیبی!
کیا کروں قلب و نظر مضطر ہیں

کتنے چہرے در و دیوار کے آئینوں سے
غمگسارانہ مجھے تکتے ہیں
جی میں آتا تو ہے لیکن پھر بھی
کوئی رہ رہ کے مجھے روکتا ہے
آہ یہ راز کہ جو کھل نہ سکا
چلنے پھرنے سے مرے پاؤں میں ٹیس اٹھنے لگی
شوق واماندہ ہؤا۔ چوٹ سی دل میں ابھری
سارے اعضائے بدن چور ہوئے
کیوں نہ دم بھر کو ذرا سستا لوں
تا کہ جب لوٹے دل آرام مرا
تازہ دم ہو کر اسے پیار سے بہلا بھی سکوں
(سو جاتی ہے)

(چونکتے ہوئے)
کس کی آواز نے خوابوں سے جگایا مجھ کو؟
دیر مت کر اڑے جاتے ہیں سنہری لمحے
گرچہ سربند کیا ہاتفِ غیبی نے اسے
تجھ کو لیکن نہیں روکا اس نے!
لب کشائی میں زیاں بھی کیا ہے
جب کوئی دیکھنے والا ہی نہیں

اور خداوند اگر دیکھتے ہیں
اُن کے ہاتھوں ہی نے تخلیق کیا
تیرے اس پیکرِ خیر و شر کو
اور پھر خود ہی اُسے ذوقِ تجسّس بخشا!

(صندوق کے پاس جاتی ہے)

اب پس و پیش سے کیا حاصل ہے
زندگی، موت، طرب، رنج و محن کچھ بھی ہو
دلِ بیتاب سے اب صبر نہیں ہو سکتا!

(ڈھکنا اُٹھاتی ہے۔ صندوق سے ایک
کثیف دُھواں نکلتا ہے اور کمرے میں
پھیل جاتا ہے۔ پنڈورا بے ہوش ہو کر
فرش پر گر پڑتی ہے۔ باہر باد و باراں
کا طوفان)

(۷)

(باغ میں)

اپی ملینتھیئس:- تھم گیا بارشِ آلام کا طوفانِ مہیب
لیکن اس کی یہ خرابی یہ ہلاکت خیزی!
پھول حیراں ہیں، پراگندہ ہے بزمِ گلشن
اور سہمے ہوئے بیٹھے ہیں نگارانِ چمن
ہر طرف ایک پُر اسرار حزیں سنّاٹا
عالم آشوب تباہی کی خبر دیتا ہے
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
ترکتازانِ حوادث کی جہاں
آج کل دعوتِ یغمائی ہے
اب تو آثارِ جہاں مٹنے کو ہیں

قہرمانوں سے کہو رحم کریں

پنڈورا:- (مکان سے آتے ہوئے)
میری لغزش سے ہوا حسنِ خیاباں برباد
عندلیبوں کے نشیمن اُجڑے
جل بُجھی شمعِ شبستانِ طرب
اور ویراں ہوا کاشانۂ گُل

اپی میتھیئس:- کیا کیا اے بُتِ رعنا تو نے؟

پنڈورا:- نہیں یارائے تکلّم مجھ کو!

اپی میتھیئس:- تری بکھری ہوئی زلفیں ترا اُڑتا ہوا رنگ
ہیں کس اندوہِ نہاں کے غمّاز؟
کیوں مجھے ورطۂ حیرت میں ڈبو رکھا ہے
صاف الفاظ میں کہہ دو آخر
کس لئے بات کو اُلجھاتی ہو؟

پنڈورا:- یہ ہلاکت یہ تباہی مری آوردہ ہے

مری فطرت نے تری حکم عدولی کر کے
فتنۂ خفتہ کو بیدار کیا
ضبط جب ہو نہ سکا میں نے جسارت کر کے
رازِ سربستہ کا منہ کھول دیا

اپی میتھیس:۔ اور اس عالمِ ایجاد کو برباد کیا؟

پنڈورا:۔ اپنی لغزش کی سزا چاہتی ہوں
میں نہیں عفو و اماں کی طالب

اپی میتھیس:۔ تو پریشان ہے نا کردہ گناہ
اصل میں ساری خطا میری ہے
بے خیالی میں ترے حسن سے بیخود ہو کر
کر دیئے فاش وہ اسرارِ نہاں
صبحِ اوّل سے جو سربستہ چلے آتے تھے
اپنے منصب کے بجا لانے میں غفلت برتی
میں نے کیوں تجھ کو اکیلا چھوڑا؟

پنڈورا:۔ اور چھوڑا تھا جو اک بار تو رہتے رُوپوش

تا کہ بنتا مرے اندیشۂ جولاں کے لئے
مژدۂ مرگِ مفاجات ترا ہجرِ دوام
اور مجھ کو یہی تعزیرِ جنوں کافی تھی
پھر مانو مری نا عاقبت اندیشی نے
دین و دُنیا میں کیا مجھ کو ذلیل و رسوا
کتنا سنگیں ہے تجسّس کا فریب
مری تقصیر کی دو مجھ کو سزا

اپی میتھیس:۔ مجھ کو بھی
مرے جذباتِ محبّت میں کوئی فرق نہیں
مرا احساس منوّر ہے ترے جلووں سے
تری لغزش بھی ہے اِک حُسنِ ادا
اس خطا سے تو بڑھی اور تری محبوبی
تری کمزوری تری سب سے بڑی طاقت ہے
جذبِ اُلفت کو کیا جس نے ترحم آمیز

پنڈورا:۔ مجھے درکار نہیں عفو و ترحم کی زکاۃ
یہ اہانت ہے مرے جذبۂ خودداری کی
عشق کی دولت سرمستی و رعنائی کو

اَبلَہانہ ہوسِ زیست کی خاطر کھو دوں؟

اِپی میتھیئس:۔ کتنا دل کش ہے ترا حُسن مری زہرہ جمال
گُنچکی لال الوراگ سے نیَن اُنجن سار
سانولی گات ہے مکھ جوت بھی چٹکیلی ہے
اے سلوچن سکمار
تو زمیں زاد نہیں دیوی ہے!

پنڈورا:۔ میں تو کمزور سی اِک اَبلا ہوں
زندگی جس کی اسیرِ خم و پیچِ تقدیر
لذت و غم کے عناصر سے اُٹھا جس کا خمیر
سرزنشِ حرفِ ندامت پہ کرے جس کا ضمیر
ناشکیبائی و پندار و جنوں جس کے مشیر
نہ نشہ ہے۔ نہ خمارِ نگہِ ساقی ہے
بزمِ آفاق میں میرے لئے کیا باقی ہے؟

اِپی میتھیئس:۔ نکہتِ لالہ و گل، حُسن، محبت، تدبیر!
جوششِ کردار سے ہر لحظہ بدلتی تقدیر
اپنے کاخوں کی سُلگتی ہوئی خاکستر سے

آؤ مل جل کے کریں تازہ نشیمن تعمیر
اور پیشانئ ایّام پہ پھر ثبت کریں
سعئ پیہم کے نشاں، عزمِ جواں کی تحریر
پھر سے کاشانۂ لالہ میں چراغاں کر دیں
اور چھلکائیں بطِ شام و سحر سے تنویر
جذبۂ عشق نسے سرگرمئ بازارِ حیات
تیرے جلوؤں سے سلامت یہ جہانِ دل گیر
بزمِ کہنہ کہ خدا ساز تھی برباد ہوئی
محفلِ نو کو کریں خلدِ بریں کی تصویر!

سوختیم و سوزشِ ما بر کسے ظاہر نشد
چوں چراغانِ شبِ مہتاب بیجا سوختیم

پرونیکس ———————— ایلوس
سلوئیس ———————— کیپس

پہلا منظر

ٹرائے کے سامنے کے میدان میں یونانی خیمہ۔ دس سالہ جنگ کا آخری زمانہ۔ گرمیوں کی ایک تاروں بھری رات۔ پرونیکس اور سلوئیس دو نوجوان یونانی سپاہی خیمے کے اندر ہیں۔ سلوئیس موم بتی کی روشنی میں پڑھ رہا ہے، پرونیکس رات کے نظارے میں محو ہے۔ منظر کے دوران میں ایک سنتری خیمے کے عقب میں وقفے وقفے سے گشت کر رہا ہے

پرونیکس:- ایسی ہی رات ہوتی ہے اپنے وطن میں بھی
میری نگاہِ شوق نے دیکھا ہے بارہا
گلزار و بوستاں چمک اُٹھتے ہیں جس طرح
جب آبشارِ نور گراتا ہے ماہتاب
کرتے ہیں مشقِ ناز سرِ آسماں شہاب

اور اس سمے یہ خیمے ستاروں کی چھاؤں میں
بجتی ہیں پائلیں کسی مہوش کے پاؤں میں
نغموں سے پُر ہیں اس گھڑی باباکے باغ و بن
آرام دِہ گھرانہ ہے آغوشِ خواب میں
شاید کوئی عزیز مرے انتظار میں
بیدار ہو بچھونے پہ لیٹا ہو کروٹیں
سینے میں خلفشار ہو اُمیّد و بیم کا
تاروں سے پُوچھتا ہو کہ تم تو ہو آشنا
اس یارِ دل نواز کا بتلاؤ کچھ پتہ
کس حال میں کہاں وہ غریب الدّیار ہے؟

(سنتری گذرتا ہے)

وہ بام و در عزیز ہیں محبوب وہ مکاں
گُل پوش و زر فشاں طرب انگیز و شادماں
خوشبُو سے مثلِ طبلۂ عنبر بسے ہوئے
وہ دار بستِ تاک وہ مخمور رت جگے
غلّے سے توشہ خانے بھرے، پھل سے بارداں
دروازے پر جو پھول ہیں آتی ہے اُن کی یاد
اور آکے مجھ جواں کو بناتی ہے کہنہ سال
نکلے ہیں گھر سے اہلِ درد آج غالبؔا

زر دانے ہوں گے چادرِ سیمیں پہ منتشر
اے بختِ نامراد یہ ہے فصل تیسری
ڈالے ہوئے پڑاؤ ہمیں اس اُجاڑ میں
اس دشتِ بے گیاہ میں ہوتے ہوئے تباہ!
اِک ایسی واردات کا لیں تا کہ انتقام
بچپن میں جو ہمارے ہوئی رونما کبھی
تھا باعثِ فساد وہ حُسنِ فسوں نہاد
دیدار بھی نہ جس کا میسّر ہوا ہمیں
پر کیا کریں نوشتۂ تقدیر ہے یہی!
اس عرصۂ مصاف سے راہِ مفر نہیں
یونانیوں کا عہد نہ پُورا ہو جب تلک
درپیش ہے ہمیں یہی کاہش، یہی کسک
حرمان و آرزو کی مسلسل اُدھیڑ بُن
ہر عضو۔ حرب و ضرب کا ہنگامہ گرم کُن
لیکن ذرا مجھے یہ تو بتلاؤ سلوئیس
فکرِ جمیل ہوتا ہے اندوہناک کیوں؟

سلوئیس:۔ تحسین و مرحبا کے تلاطم کے باوجود
رہتا ہے یہ خیال حریمِ دماغ میں

یہ چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات
ہر جلوہ کائنات کا ناپائدار ہے
فانی شباب و حسن، گریزاں بہارِ عمر

پیروٹیکس:۔ لگتی نہیں یہ بات تمہیں کیا عجیب سی
ہیں جنگ میں ہم اتنے زمانے سے مبتلا
آرگو کے ایک ننھے سے گلیارے کا خیال
آشوبِ استخوان ہے سوہانِ رُوح ہے
نفرت کا شائبہ بھی نہیں اب تو خون میں
اُن کے خلاف کرتے ہیں روزانہ جن کو قتل
فطرت سی بن گیا ہے فریضہ قتال کا
خالی ہے دل نشاط سے، ذہن اضطراب سے
غم ہے نہ انبساط، تحیّر نہ آرزو
میدانِ جنگ میں کسی ساعت، کسی گھڑی
یہ کالبد ہمارے یہ بت گوشت پوست کے
ہو سکتے ہیں، عدو کی طرح لقمۂ اجل!

مسلوئیس:۔ یہ نقطۂ نظر ہے طبیعت کا اقتضا
بات اس میں کوئی حیرت و افسوس کی نہیں

جو بھی بسر کرے گا رفاقت میں موت کی
ویرانیٔ حیات پہ دن رات نوحہ خواں
ماضی سے سرگراں، دمِ فردا سے نا اُمید
ہرآن زندگی کو اجل خوردہ دیکھ کر
بڑھتا ہے اختلاج دلِ بے قرار کا
اس عرصۂ جہاں میں ہر اک شے ہے بے ثبات
ہر لمحہ زندگی کا ہے مرہونِ حادثات
تقدیر سے کر آشتی نفرت کو بھول جا
ممکن ہے کس طرح بھلا مُردوں سے دُشمنی؟
تلوار اپنے سر پہ لٹکتی ہے موت کی
آجائے گا اَجل کا بلاوا ہر ایک کو
دُشمن ہو یا کہ دوست، پرو نیکس تم کہ میں
سب چلتے پھرتے لاشے ہیں زندہ نہ جانیو!

(سنتری گزرتا ہے)

یہ کائنات اپنی اک آسیب ہی تو ہے
غولوں کی طرح لوگ ہیں جس میں رواں دواں
دروازے پر حیات فقیروں کے بھیس میں
آواز دے رہی ہے پیالہ بکف کھڑی

اس چل چلاؤ میں ہمیں نفرت سے کام کیا
ہم کو نہیں نصیب وہ گوشہ فراغ کا
وہ عافیت کا کنج جہاں بیٹھ کر خیال
شامِ ابد سے اپنے ملاتا ہے سِلسلے
اور پھر دل و دماغ میں ہوتے ہیں موج زن
جذبات رنگ رنگ کے، احساس گُونہ گوں
نفرت کو چھوڑو منبر و محراب کے لئے
آرائشِ سریرِ زرِ ناب کے لئے
اپنے لئے نہیں یہ کدورت کی نعمتیں
یہ رنج یہ کرودھ یہ کینے یہ نفرتیں
ان چونچلوں سے ہم کو بھلا واسطہ ہی کیا؟
قربانِ گاہِ موت کی بس ہم تو بھینٹ ہیں
ہے مرگِ ناگہانی سے ہر وَقت سابقہ

پرونکیس:۔ سستی ادائے فرض میں خوئے نکو نہیں
رُوحِ صِربیہ گو نہیں غایت سے آشنا
ہے مادرِ وطن کا ہر ارشاد ہم پہ فرض
توقیر و انبساط کا موجب ہے امتثال
کہتا ہوں موت کو تہِ دل سے خوش آمدید

وقتِ معیّنہ پہ مروں گا ہنسی خوشی
چاہیے وہ وقت آج ہی کی رات کیوں نہ ہو
لیکن شباب کے لئے کتنا ہے تلخ ناک
منہ موڑ کر بہارِ چمن زارِ دہر سے
وصل و وداع و عشرت و حرماں کو چھوڑ کر
خوابِ ابد سے، طولِ امل سے کنارہ گیر
فرزند و زن کے رشتۂ شیریں سے منقطع
متروک کر کے رسمِ تب و تاب و سوز و ساز
پینا یہ گھونٹ خون کے آغوشِ مرگ میں
اور کہہ کے خیر باد علوم و فنون کو
طور و طریق سیکھنا شب خون و شبد کے!
جو سر بسر شباب سے پوشیدہ چاہئیں
نوشابِ زندگی کو پیئے ڈگڈگا کے وہ
اس کے لئے تو گلشنِ عالم کی رونقیں
اس کے لئے دیار و دمن کی چہل پہل
یہ کاروبارِ مرگ کہولت کو زیب ہے
شورِ نبرد میں بھی مجھے بھولتی نہیں
وہ اہلی گہلی انجمنِ آرزو جسے
شوقِ سپاہیانہ نے جبراً چھڑا دیا

وہ میری ندّیاں وہ مرے باغ و بوستاں
کانوں میں شہد گھولتی وہ جھٹپٹے کے وقت
کھرے میں چلتے بیلوں کی پُر خواب گھنٹیاں
یاد آئیں بار بار ستائیں تو کیا کریں!

سلوئیس:- میں جانتا ہوں خوب کہ ہوں ذائقہ شناس
حاصل ہے ذکرِ رفتہ کا رنج و فسردگی
میٹھی سُہانی یادیں بناتی ہیں مضمحل
یادیں وہ گھر کی نرم سی، نازک سی، دُور سی
کھلتی ہے سُوئے بحرِ ایوں میری خواب گاہ
سنگت ہے جس کی سوندھی سُہانی شمیم سے
میں نے انہی طلسمی جھروکوں میں بیٹھ کر
تصنیف کیں وہ نظمیں، ہے جن میں جمالِ فن
سمتِ ٹرائے آتا ہے جب کوئی بادباں
جھٹ ذہن میں اُبھرتی ہے اس خوابگہ کی یاد
اُٹھتی ہے ہُوک دل میں، رگ وپے میں سنسنی
وہ کمرہ دل نواز مرا عین گھاٹ پر
ملّاح پیٹ بھر کے لگاتے ہیں۔ قہقہے

دن بھر جہاں طلوعِ سحر سے غروب تک
کرتا ہے منتشر انہیں آخر سکوتِ شام
سِسِلی کے پانیوں میں جب آسودگی کے بعد
لیتے ہیں راہ اپنی جہازوں کے کارواں

پرونیکس:- پیلوس بس تمہارے خیالاتِ نغز نے
اوڑھی قبائے نظمِ طرح دار و خوش گوار
دیکھے تھے خواب میں نے بھی ایتھنز میں بہت
جو گرچہ شعر و نغمہ کی لَے میں نہ ڈھل سکے
پر گردوپیش میرے سدا مرتعش رہے
مرتا ہوں رشک سے، ہوں مقدّر سے شکوہ سنج
بخشا مذاق مجھ کو نہ آہنگ و لحن کا
رکھا تہی نصیب شعورِ سرود سے
ہوتی ہے خال خال عطا نعمتِ سخن
تھے خواب وہ مرے متعلّق بہ مملکت
تطہیرِ کاروبارِ سیاست تھا منتہا!
کلَ پُرزے سب مشینِ ریاست کے ہوں درست
جمہور ہُوں نظامِ معیشت سے مطمئن

دولت فراغ و عزم و عمل کی ہو ایسی عام
ہر شخص اپنے خواب کی تعبیر آپ ہو
ہو اس کے ہاتھ اپنے مقدّر کی باگ ڈور
پر امتدادِ وقت سے دھندلا گیا وہ خواب
گردِ تڑائے نے یہ سکھایا ہے تین سال
ہنگامِ شب دعائیں کروں نیند کے لئے
اپنے حریفِ سخت کماں کو ہرا سکوں
تیزی میں مستعدی میں اس سے بڑھا رہوں
ہاں سلوئیکس تمہارے نزالوں کا کیا بنا؟

سلوئیس :۔ خلوت سرائے دل سے گذرتے ہیں گاہ گاہ
جس طرح بھولے بسرے سے بچھڑے ہوئے رفیق

پرونیکس :۔ ہے شوق رہ نورد، اجل قاطع طریق!

(سنتری گذرتا ہے)

پلتے رہے جو زمزمے صدیوں کی گود میں
انسان کی مسرّت و راحت کے واسطے
کھلنے سے پہلے ہی کہیں مرجھا کے رہ نہ جائیں

پر یہ خیال روکتے ہیں فرض سے مجھے
قائم مقام زندگی کے جس طرح ہوں بھوت
ہاں! بیت بھی چکی وہ گھڑی جس میں چاہیئے
سونگھوں سُنوں، فصیل پہ آئے پہ آہٹیں
جو کوئی ہاتھ آئے، ہو گردن سے سر جُدا
میں نے تمہیں بتایا تھا آخر فصیل پر
اِک پاؤں دھرنے کی جگہ میں نے بنا ہی لی
اِک پائدان شہر پنہ پر رسائی کا
یہ کش مکش عجیب ہے مرگ و حیات کی
آپس میں دونوں آنکھ مچولی ہیں کھیلتی
پَل بھر میں ایک شوخ نوا ریز زندگی
ہو جاتی ہے خموش ہمیشہ کے واسطے
میّت پہ ایسے ہوتا ہے اہلِ عزا کا بَین
ماتم گسار روئیں گے جس طرح میرے بعد
نفرت ہے سخت، گو مجھے اس کاروبار سے
پائیں نہ کوئی راہ تو ناچار کیا کریں
ناشاد و شاد کرنا ہی پڑتا ہے سب قبول
اب تم بھی سوؤ، دیر ہوئی، صبح پہرہ ہے
(مسلح ہوتا ہے اور چھنے میں اپنے آپ کو لپیٹتا ہے)

ہاں شب بخیر، کون سی شے پڑھ رہے ہو تم؟

سلوئیس:۔ نغمے جو میرے صوبے کے اک شخص نے لکھے
آبی طیور اُڑتے ہیں کھُلتے ہیں بادباں
ہیں ان میں لہلہاتی چراگاہیں دیس کی
امواجِ تند رو پہ پھیرے وہ سالوئے
اس کا کروّن نام تھا میں بھی بشرطِ زیست
لکھوں گا ایسے گیت

پرونیکیس:۔ (جو شراب کا ایک جام انڈیل کر پی چکا ہے)
مجھے اس کا ہے یقیں
سو جاؤ میرے آنے سے پہلے تو شمع کو
گُل کر کے سونا، سُن لیا، اچھا تو شب بخیر!

سلوئیس:۔ تقدیر سازگار تمہاری ہو، شب بخیر!

پرونیکیس:۔ پانی لگن میں ڈال دیں یہ بھولنا نہیں
ہاتھ اس میں ہو بھی جاتے ہیں آلودہ خون سے
(باہر جھانکتا اور نکل جاتا ہے)

(سنتری گزرتا ہے)

سلوئیس:۔ (پڑھتے ہوئے)

بحیرۂ سِسلی کی سیاہ موجوں پر!
مچھیرے جال لئے ڈولتے سنبھلتے ہیں!

پردہ!

دُوسرا منظر

ٹرائے کی شہر پناہ۔ کیپس ایک نوجوان تر وجن سپاہی اس میدان کے رُخ جہاں یُونانی خیمہ زن ہیں۔ پہرہ دے رہا ہے۔

ایلوس ایک دوسرا نوجوان سپاہی اس کا دوست خرسی پوستین پہنے اس کے پاس آتا ہے۔

ایلوس:۔ کب ختم ہے یہ پہرہ ؟

کیپس:۔ دو ساعت کو آدھی رات

ایلوس:۔ ہیں کیسے دل فریب یہ خیمے تہِ نجوم !
باری ہے آج میری کہ اک سائے کی طرح

جاؤں وہاں کروں کوئی یونانی نوجواں
شمشیر سے دو نیم، کھسک آؤں چپکے سے
عینِ شباب میں یہ ہنر ننگِ عمر ہے
دو سال سے وظیفہ ہے اس نامراد کا
ہفتے میں ایک بار کروں آدمی شکار
بس ایک دفعہ میرا نشانہ گیا خطا
اک سینکڑے کا کر چکا لگ بھگ میں خاتمہ
اک سو جواں مری ہی طرح ڈیل ڈول میں
سینے دہکتے آتشِ عزّو غرور سے
دل ہلہلاتے عشق و محبّت کے سوز سے
رگ رگ میں سنسناتی رہِ زندگی کی آنچ
ان کے جمال و حُسن کو میں نے کیا تباہ
ہیں جو قتیلِ حُسن و شہیدِ جمال ہوں
ہوں عنفوانِ زیست سے جو آرزو پرست
جس باولے کی زندگی کا مقصدِ وحید
ہے جستجوئے حُسن و تلاشِ سکونِ دل
ہیلنؔ کو کر دے کاشکے تقدیر بد نما
نو سالہ کشمکش ہو مبدّل بہ آشتی
ہو دور دورہ امن کا ارضِ ٹرائے میں

ارکانِ سلطنت جو پراگندہ ذہن ہیں
چھکڑوں کو جھاڑ پونچھ کریں منڈیوں کا رُخ
ہاں کیا، عروسِ بحر، کی تکمیل ہو چکی؟

کیپس:- کرتے ہو یہ سوال ہمیشہ مرے ندیم!
منقاش زنگ خوردہ، شکستہ ہیں پائداں
کیڑوں کی نذر ہے مرا پیراہنِ کتاں
ایلوس میرے ذہن میں بستا تھا بُت کدہ
شیرازۂ خیال پریشاں تھا مجتمع
عورت کا حُسن سلسلہ جنبانِ فکر تھا
سرمایۂ سرور، تخیّل تھا مو بمو
اِک تندرست مرد کے اعضا کو دیکھ کر
پیٹّھے گٹھے گٹھائے رگیں خون سے تنی
ہر خال بے نظیر، ہر اک نقش دل پذیر
لگتا تھا تازیانہ سمندِ خیال کو
شہرِ ٹرائے کے گلی کوچوں میں پھرتے لوگ
مرمر میں ہوتے جلوہ نما آن بان سے
رُوپ اِک نیا میں بخشتا اس سرزمین کو
خونِ جگر بہاتا میں تخلیقِ حسن میں

کرتا وولیعتوں کو میں صرفِ جمالِ یار
بد دل مگر میں گردشِ ایام سے نہیں
لا تقنطوُ نشان ہے ہر حسُن کار کا
مایُوسی مذہبِ دل زندہ میں کفر ہے
چھٹ جائے تیرگی ذرا جنگ و جدال کی
یکسانیٔ حیات ، تنوّع کا رنگ لے
کیفیتّوں میں آئے اُمنگوں کی اوج موج
ہو دُور دل دماغ سے یہ عارضی تھکن
تن من سے اپنے کام میں لگ جاؤں گا میں پھر
پُر آب و تاب ہو گا مدینہ ٹرائے کا
نقش و نگار اس میں کروں گا میں اس طرح!

ایلوس:۔ مصرف اگر صحیح ہمارا کرے ٹرائے
ہم کر دیں اس کو روکشِ فردوسِ گمشدہ
تبلائیں کاہلی کی مضرّت ہر ایک کو
سچے ہوں کاروبار میں پکے ہوں قول میں
دیکھا ہے میں نے چشمِ تصوّر سے بارہا
شہر ٹرائے ایک ریاست ہے سادہ سی
جس کی حدود میں نہیں پندار کا چلن

ہر شخص بات کرتا ہے اپنی بساط کی
خالی ہیں سینے کینے سے برتاؤ پیر کے
محتاجِ ساز و برگ نہیں شیوۂ وفا
درکار کیا ہے نیکی و انصاف کے لئے
صدق و خلوص و سعی کی پونجی قلیل سی
افتاد ہے ہماری یہی عدل و راستی
موقعہ ملے پنپنے کا رجحانِ طبع کو
تو وہ چلے ہمیشہ رہِ مستقیم پر
یونانیوں سے برسرِ پیکار کیوں ہیں ہم
مانا کہ تھا طبیعتوں میں رنج و اشتعال
ہیلن کو لایا جس سمے پیرس ٹرائے میں
اور آئی پیچھے پیچھے منی لاس کی سپاہ
اب تو مگر یہ قصہ پرانا بھی ہو چکا
اکثر مرے دماغ میں کوندا ہے یہ خیال
یونانیوں کے خیموں میں جب بھی گیا ہوں میں
یہ بے گناہ جس کا کیا میں نے سر قلم
میرا قصور وار تھا، مجرم تھا؟ کاشکے
ہم دونوں بھائیوں کی طرح آشتی کے ساتھ
مل کر فلاحِ عام کی تدبیریں سوچتے!

کنیا یا ہیں اگرچہ، مگر فرض فرض ہے

کیپس:۔ ہے کون واں ؟

آواز:۔ ٹرائے و مرگِ ٹرد جنی

کیپس:۔ گذر و ٹرائے !

ہے یہ سماں کیسا دلفریب
میدانوں ہیں سکوت کا پہرہ ہے آج رات
گویا یہ "تارے روشنی ہیں لالٹین کی
ایکوس رکھو تدِ نظر احتیاط کو
جاؤ چوکنے ہو کے بہت دیکھ بھال کے
اُلفت کو تیز کر گئے، احساس کو شدید
داغِ فراق دے کے رفیقانِ دِل نواز
یہ گرمیوں کا حُسنِ درخشاں ہے خوفناک
ڈرتا ہوں تم پہ کوئی مصیبت نہ ڈھائے یہ
ایسی ہی راتیں حادثوں کو ہوتی ہیں پسند

ایلوس:۔ پیچ و خمِ خیام سے واقف ہُوں اس طرح
جس طرح آشنا ہُوں فصیلِ ٹرائے سے
دے سکتا ہوں میں چکمہ ہر اک پاسبان کو
بادل کا جیسے سایہ، کہ جھاڑی کوئی گھنی
بچ نکلا ہوں میں سینکڑوں دفعہ اسی طرح

کیپس:۔ ہوتا تمہارے ساتھ تمہاری جگہ میں کاش!

ایلوس:۔ منقاش منتظر ہیں یدِ حسنِ کار کے
اصنامِ آرزو و بتانِ خیال کو
اہلِ جہاں کے عیش و مسرت کے واسطے
آباد و منتقل کرو اجسامِ سنگ میں
حسنِ نظر ہو پیکرِ محسوس میں اسیر
فن کار کی تو سعئ مسلسل میں ہے نجات
ہے روزگار اس کا عبارت ریاض سے
اظہار کے وسیلے ہیں سرچشمۂ حیات
ان کے بغیر اس کو کہاں لطفِ زندگی؟

کیپس:۔ تم بھی تو آتے ہو اسی زمرے میں، میرے یار!

تطہیر و تزکیہ تو ہے اِک مقصدِ عظیم
ہو مادرِ وطن کے حقیقت میں تم سپوت
موقع ہو تو دلاؤ جفاکش عوام کو
جابر کے پنجۂ ہائے زبردست سے نجات
توفیقِ کار کاش میسّر ہو دونوں کو
ہو جاؤ تم تدبّر و تدبیر میں مگن
میں منہمک تصوّر و تصویرِ حسُن میں
کس وقت ہو گی واپسی اس چور گشت سے؟

اپلوس :- پہرے کے ختم ہونے سے پہلے ہی غالباً
عین اس مقام پر بھرے تاروں سے جب گگن
پاٹنے ہی تم اشارہ گرا دینا ریسماں

(سیٹی بجاتا ہے، اور کنگرے پہ چڑھتا ہے، جس سے ایک رسّی لٹک رہی ہے)

کیپس :- ماحول سازگار ہو تقدیر مہرباں
لازم ہے احتیاط تمہیں ، اچھا الوداع!
(اپلوس نیچے میدان میں اُتر جاتا ہے، کیپس رسّی اوپر کھینچ لیتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے سکوت)
کیپس :- (دیوار پہ اِدھر اُدھر گشت کرتے ہوئے)

برف گرے جب موسمِ گُل میں
آپس میں گھُل مِل جاتے ہیں
ایک ہیں سب یونانی تر و جن
فرق نہیں کوئی ان دونوں میں
ایک ہی پھلواڑی میں جیسے
رنگ برنگے پھُول کھلے ہوں
ایک ہی ایوانِ عشرت میں
فانوسِ صد پہلو روشن
غنچہ کھلے گا تو بکھرے گا!
ہم سے تو لیکن غنچہ اچھا
موت شباب کی پرچھائیں ہے
وقتِ رواں کے آئینے میں
موت کے باعث نغمہ لبوں پر
آہ، ادھورا رہ جاتا ہے!
وقت کا دریا بہہ جاتا ہے!
چلتا ہے اِک ساتھ ہمیشہ،
ساتھ ہمارے، پر پوشیدہ
ہاتھ یہ مرگِ مبرم کا ہے
جس کا کٹیلا وار ہے کاری

آج مری کل تیری باری
کام کسی کی آئے نہ یاری
بے صرفہ ہے آہ و زاری

(اپنے پیچھے حرکت سنتا ہے اور سرعت سے مڑتا ہے)

یہ کون ؟

پرڈیکیس :- ہوں تمہارے لئے مژدۂ اجل
یونانی نوجواں جو تروجن کی موت ہے

(اس اچانک حملے سے کیپس مغلوب ہو جاتا ہے اور بغیر کوئی آواز نکالے گر پڑتا ہے)

پرڈیکس کا خنجر اس کے سینے میں پیوست ہے جسے وہ باہر نکالتے ہوئے اپنے مرے ہوئے حریف پر نگاہ ڈالتا ہے اور جھرجھری سی لیتا ہے۔ دیوار پر سے جھانکتا ہے اور پھر انتہائی محتاط انداز سے اسی مقام سے نیچے اُتر جاتا ہے)

تیسرا منظر

دوبارہ یونانی خیمہ۔ سلوئیس ابھی تک پڑھ رہا ہے۔ بتی جل رہی ہے۔ ایک خدمتگار پانی کا ایک بڑا گھڑا لاتا ہے اور خیمے کے باہر پڑے لگن میں اُنڈیل کر چلا جاتا ہے۔ ایک لمحے بعد سنتری خیمے کے عقب۔ سے گذرتا ہے۔ چند لمحوں کے لئے خاموشی۔ سلوئیس کتاب کے ورق اُلٹتا ہے خیمے کے سامنے سایوں میں سے ایلوکس اپنی پوستین خرسی میں دبے پاؤں بغیر آہٹ کئے خیمے کے دروازے پر آپہنچتا ہے اور اسی وقفہ سکوت میں اس کا خنجر یونانی کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ ایلوکس مرتے ہوئے کو سہارا دے کر اسے خیمے کے اندر ایک کوچ پر لٹا دیتا ہے۔ سنتری گذرتا ہے۔ ایلوکس سانس روکے قدموں کی چاپ کے مٹنے کا انتظار کرتا ہے۔ اور پھر جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح چور طریقے سے غائب ہو جاتا ہے۔ ایک وقفہ۔ پرونیکس تاریکی میں سے نمودار ہوتا ہے۔ اور زمین پر اپنا لبادہ پھینکتے ہوئے سیدھا لگن کے پاس جاتا ہے اور اپنے ہاتھ دھونے لگتا ہے۔

پروٹیکس:- ہیں ! کیا ابھی تک ہو غریقِ مطالعہ ؟
یہ کیسے نغمے ہیں جو جگاتے ہیں رات بھر؟
اُف سلوئیس یہ کام بھی ہے کیا گھناؤنا !
اک لفظ بھی نہ بول سکا وہ زبان سے
تاروں میں محوِ گشت وہ یوں تھا فصیل پر
جس طرح کوئی عاشقِ جانباز باغ میں
سرخوش شرابِ وعدۂ وصلِ نگار سے
کلیوں سے گفتگو کرے سونگھے گلاب کو
آخر تک لبوں پہ تھے اشعار مرتعش
وہ گنگنا رہا تھا جنہیں مست و بے خبر
ڈھلتی ہے آبِ سرد سے کلفت دماغ کی
بھرتا ہے تن بدن کو یہ ایمائے خواب سے
نیند اُلجھنوں کا سہل و مجرّب علاج ہے

(سنتری گذرتا ہے)

مجھ کو تو روشنی کی نہیں کوئی احتیاج
بتّی بجھا کے تم بھی تو سو جاؤ سلوئیس!

(خیمے میں پہلی بار جھانکتا ہے)

کیا ! سو رہے ہو کپڑے اُتارے بغیر ہی
یہ تو بد احتیاطی ہے روشن ہے شمع بھی

آواز سلوئیس تمہیں دیتا ہوں بولو بھی
اُف دیوتاؤ! سلوئیس! او سلوئیس اُہو!
چُپ چاپ تم بھی داغ جُدائی کا دے گئے
میرے انیلے دوست اکیلے ہی چل دیئے
کیا دوستی میں ریت یہی ہے نباہ کی؟
وہ خواب منتشر ہوا ٹوٹا حصارِ سحر
پادر ہوا ہوئے سبھی قول و قرارِ مہر
قانون کیا یہی ہے مکافاتِ دہر کا
چلتا ہے یوُں ہی داد وستد کا یہ سلسلہ
دیوار پر ٹرائے کی بھی آئے گا ضرور!
ہاں آئے گا ضرور، کوئی آئے گا ضرور!

(سنتری گذرتا ہے)

چوتھا منظر

ٹرائے کی شہر پناہ۔ کیپس کی لاش ستاروں کی روشنی میں پڑی ہے چند لمحوں بعد نیچے سے ایکوس کا سگنل آتا ہے۔ وقفہ۔ سگنل دوبارہ آتا ہے۔ وقفہ۔!

(پردہ)

وفاداری بشرطِ اُستواری

سرمدؔ غمِ عشق بوالہوس را نہ دہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند
تا سر نہ دہی بہ سرفرازی نہ رسی
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند!

پرگُو ——————— پیرس
جلبسا ——————— الونی
کورونیس ——————— ہیلن

اماٹ

(کوہ ایڈا۔ دائیں سمت ایک جھونپڑی تاکوں۔سے ڈھکی ہوئی جو آدھی نظر آتی ہے۔ پس منظر میں درخت اور جھاڑیاں وسط میں کھلی جگہ جہاں سے نیچے ترائے کے میدان کو پگڈنڈی جاتی ہے۔شام کے سائے دراز ہو رہے ہیں۔ دو لڑکیاں پرگو اور ملیسا راستہ چڑھ کر اس کھلی جگہ سے نمودار ہوتی ہیں)

(پرگو پہلے داخل ہوتی ہے)

پرگو:۔ جلدی کرو کہ دیر بہت ہو چکی ہمیں

ملیسا:۔ ٹک اس نگوڑی سانس کو تو ٹھیک ہونے دو!

پرگو:۔ جھک جھک کے کہہ رہے ہیں لگڑ ہارے شب بخیر

دیکھو تو کیسا ڈھیر اُنہوں نے لگا لیا
حالانکہ باقی ہے ابھی گرنا بلوط کا

ملیسا:- کچھ دیر رُک چلو یہ نظارہ ہے دلفریب
دیکھو وہ کھینچتے ہیں طنابوں کو زور سے
لرزش ہوئی تنے میں ہویدا ہُوا شگاف
لٹکا ہُوا وہ لگتا ہے کیسا ڈراؤنا
وہ گر رہا ہے دیکھو ہلا سرنگوں ہُوا
اِک آہِ دل خراش سے آخر وہ گر پڑا
کیا لرزہ خیز شور ہے کیسی پکار ہے!
ہکطورؔ بھی گرا تھا اسی دبدبے سے کیا
کار آزما اخیلؔ کے بھرپور وار سے؟
ایسے ہی ٹھاٹھ سے وہ گرا ہوگا بالیقیں

پرگو:- آتی نہیں ہے شرم یہ کہتے ہوئے تمہیں
تم کو مجالِ گفتگو اس روزِ بد کی ہے
جس دن اُٹھی ٹرآئے کے قلبِ فگار سے
وہ آہِ سینہ چاک جو ہے نوحہ گر ہنوز
میں نے اسے سُنا جو لبِ کوہسار سے

بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے

ملیسا:- میں ایک بھولی بھالی سی بچی تھی اُن دنوں
میں سوچتی ہوں کیسی تھی شیون کی وہ صدا
ہم نے سنی جو شہر کے دروازوں کے تلے؟
وہ کل تلک تو بند تھے میدان صاف تھا
لیکن وہاں سے گذرے جو ہم آج صبح دم
تو ایسا شور و غل تھا وہاں گیرو دار کا
موجوں کی ریل پیل ہو کھاڑی میں جس طرح
نیزے دمک رہے تھے پھریرے تھے پُرفشاں!

پرگو:- آؤ بھی اب تو پھیل گئے سائے شام کے
تاریک ہو نہ جائیں درختوں سے راستے

ملیسا:- پرگو مجھے بتاؤ نا یہ ماجرا ہے کیا
پریام کا ہُوا کہ اغمنوں کا انتقال
یا عازمِ عدم ہُوا پیرس سا خوش جمال؟

پرگو:- خاموش پڑ نہ جائے الونی کے کان میں

اس بات کی بھنک کہ نہیں خیر پھر تری
کر سکتی ہے وہ گلُ، گلِ عارض کی آب و تاب
تھن بھیڑ بکریوں کے بنا سکتی ہے وہ خشک
شاداب جوئے شیر ہو کا ہیدہ مثلِ کاہ
گلّے مویشیوں کے وہ کر سکتی ہے تباہ!

ملیسا:- پیرس کو تو مگر نہ وہ اپنا بنا سکی

پرگو:- مُردوں کو بخش سکتی ہے وہ زندگی نئی
اس واقعے کو ہوتی ہیں دو گرمیاں کوئی
کاٹا تھا کالے ناگ نے جب میلؔدون کو
تو کھمب کی طرح ہؤا گوشت اس کا سرد و زرد
لائی وہ کنجِ کوہ سے کچھ ایسی پتّیاں
سب زہر معجزانہ جنہوں نے چڑھا لیا
مسموم بچنِ مرگ سے آزاد ہو گیا
اور اب

ملیسا:- تو سانولے ہیں عذار اس کے نَندنیؔ
کتنا عجیب ہے مجھے آتی جو ساحری

پیرس کو ریشمی دھاگوں سے باندھ کر

پرگو:- دیکھا نہیں ہلینہ کی آنکھوں کو غالباً؟

ملیسا:- یونانی ہے وہ اور منی لاس کی حرم

پرگو:- خاموش ——!

ملیسا:- بود و باش ہے اس کی اسی جگہ؟

پرگو:- (سر ہلاتے ہوئے)
اب بھی وہ شاندار ہے دیکھا ہے میں نے تو
قائم ہے عنفوانِ جوانی کا بانک پن
کہتے ہیں کہنے والے کبھی شادماں بھی تھی
لیکن قدم بڑھاؤ بہت دیر ہو چکی

ملیسا:- میں آ رہی ہوں پھول بنفشے کا بہ اہا!
مانندِ راہبات لباسِ کبود بن
پیروں کے نیچے آتا بچا اتفاق سے

اس میں نہاں ہیں کتنی سہانی حکایتیں
شیریں ترین ہوتی ہے ہر یافتِ نخست

پرگو:۔ (دائیں سمت ایک کھڑے ڈھلوان جادے پر چڑھتے ہوئے)
دو ہاتھ میرے ہاتھ میں، دیکھو نشیب میں
ڈولی اِک آ رہی ہے ادھر جانبِ فراز

میلیسا:۔ وہ رُک گئے ہیں آ کے لکڑہاروں کے قریب
کچھ کہہ رہے ہیں ان سے، ذری آؤ رُک چلیں

پرگو:۔ ہرگز نہیں خموش الونی ہے سامنے
(دونوں لڑکیاں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوئی اوپر چڑھ جاتی ہیں۔ الونی دائیں سمت سے نمودار ہوتی ہے کلام ذیل کے دوران میں وہ جھونپڑی سے لکڑیاں اٹھا اٹھا کر باہر لاتی ہے اور ایک ایک کر کے منظر گہہ کے وسط میں اوپر تلے رکھتی جاتی ہے۔)

الونی:۔ پیرس کو میں نے خواب میں دیکھا گذشتہ رات
پردے پہ تیرگی کے وہ اُبھرا پہ کس طرح

زردی کھنڈی تھی آنکھوں میں چہرہ ستا ہوا
چھائی تھی خال و خط پہ مریضانہ خستگی
صرصر سے مضمحل گلِ شاداب جس طرح
پیچھے جھکا ہوا تھا نقاہت سے اُس کا سر
گونگے تھے گرچہ ہونٹ نگاہیں فصیح تھیں
کرب دروں کی چھوٹ سی چہرے پر عکس ریز
بے حس ہو جیسے ایسے معلق تھا ایک ہاتھ
پر بڑھ رہا تھا دُوسرا شاید مری طرف
پھر رُک گیا یہ سوچ کے کون التجا کرے
پنہاں کوئی اشارۂ غیبی نہ اس میں ہو
وہ ہاتھ اُٹھا ہوا سا، وہ حسرت بھری نگاہ
زخمی نہ ہو کہیں مری جانے مگر بلا
ہیلنؔ کے بازوؤں میں مچلتا ہے بے وفا
سہلائے سو ادا سے وہی گرم کنپٹی
آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ملائے لبوں سے لب
اے تاک پر مچلتی گلُ انداز کونپلو!
نقش و نگار جذب کیے نو بہار کے
آئی کہاں سے تم میں یہ شیریں شگفتگی؟
احساس کیا نہیں تمہیں اس کا کہ اسکے قبل

انگوروں کے یہ خوشے طراوت سے ڈبڈبائیں
ماحولِ خوش گوار ہیں دانے پکیں رسیں
پُھرتیلے چھوکرے چھیل چھبیلے کھلنڈرے
ہنس مُکھ کنواریاں، سمن اندام، سانولی
چھڑنے پہ رس انار کا، لالی گلاب کی
جیسے صراحیاں نہ چشیدہ شراب کی
بیلوں سے توڑ تاڑ کریں گے کشید مے
پس جائیں گے یہ پاؤں میں پکنے سے قبل ہی
یہ خونِ ناب و سُرخ ڈھلے گا شراب میں
بے رحمئ زمانہ کا تم کو نہیں شعور
بیدادِ روزگار سے ناآشنا ہو تم
دکھلا رہی ہو رس بھرے جوبن کی جو بہار
رونے کا ہے مقام، یہ ہنستی ہو کملیو،
جس کو بہار سمجھی ہو پردہ خزاں کا ہے
ایسے ہی میرے سینے میں اُمّید کی نمود
جو آبیائے دہر میں پس پس کے رات دن
بنتی ہے غیر کے لئے سرمایۂ شہود
مٹتی نہیں ہے پھر بھی تب و تابِ آرزو
یہ زندہ ہے شکستِ مسلسل کے باوجود

دُنیا میں کوئی ہو گا بھلا مجھ سا بھی بیوقوف
بولیں قصندرہ کو سیہ بخت و نا مراد
اس کے سُخن کو چونکہ سمجھتے ہیں سب دروغ
ہے لیکن اپنے آپ پر اس کو تو اعتماد
ہیں تیرہ روزگار ہر آئینہ بے سواد
مٹی میں رنگ روپ ملا ڈھل گیا شباب
مثلِ غبارِ سوختہ ہوں خانماں خراب!

(آگ جلاتی ہے)

اے آگ شعلہ ریز ہو، ماحول کو اجال!
پیرس کو ایک بار ٹرائے سے لائی تو
بھولا وہ میرے واسطے رقص و سرود کو
لکڑی پرانی جلتی ہے سوزِ سریع سے
یہ قلبِ ناصبور بھی ہوتا جو کاشکے
مانندِ چوبِ خشک تو شعلوں میں جھونکتی
لے جاتی بادِ صبح اڑا کر غبار کو
پھر میری چھاتیوں میں نہ اُٹھتی یہ ٹیس سی
پھرتی نہ رُوم رُوم میں لہر اضطراب کی
مجھ کو بلا مبالغہ کہتے ہیں ساحرہ
ماہ و نجوم میرے اطاعت گذار ہیں

چرواہے جانتے ہیں مری کار کردگی
کر سکتی ہوں میں مار گزیدہ کو تندرست
چنگا کیا تھا میں نے ملا ددنِ نوجوان
ہر چند وہ کھڑا تھا لبِ گورِ تنگ و تار
چمکا روئے نگار، شبستاں مہک اٹھا
بوٹی وہ اس چٹان پہ مجھ کو نظر پڑی
جو اسم زندگی کا مرے ہاتھ میں ہے، آج
البیلے پن سے پھوٹ رہی تھی وہ برگ برگ
اوروں کو اس فسردہ نصیبی کے باوجود
دوں مژدۂ شگفتنِ گلُ ہائے آرزو
غیروں کے چاکِ جیب و گریباں تو سی سکوں
دامن کو اپنے کر نہیں سکتی مگر رفو

(آگ کے پاس لیٹ جاتی ہے)

دس سال بیتے زندگیٔ برق تاز کے
دس سال میرے واسطے اک آہ کی طرح
اس پر مرورِ وقت کا کوئی اثر نہیں
عرصہ ہوا وہ وضعِ کریمی بدل چکی
تھی مثلِ دیوتا کے جبیں جس کی تابناک
دید آرزو تھی جس کی، سخن مایۂ نشاط

پیرس تو ہے پہ اگلا سا پیرس نہیں رہا
ہیلن کے پھول بن میں خراماں ہے آج کل
زنبور کی طرح پئے مدرا، کرے کلیل
آخر ہوس پرست ہی نکلا یہ مرد وا
ہیں مبتلائے غم ہوں وہ محوِ نیاز و ناز
کیا جانے گی نگاہی منی لاس کی مگر
اِس موسمِ بہار کی رعنائی جمال
جب رونقیں شباب کی ہم پر نثار تھیں
کیا تھی وہ شوخ ساعتِ ساعات کیا کہوں
سینے میں راز و شوق کے طوفاں لئے ہوئے
مست انکھڑیوں میں حوصلہ بوس و کنار کا
تن اک دریچہ نور تو لب اِک قنینہ مُل
شوقِ جسور دست و گریباں حجاب سے
جس وقت چمن سے ایک پریزاد کی طرح
وارد ہوا وہ خواب گہہِ نوعروس میں
ہر دل عزیز اُٹھتا ہوا خوب رو جواں
دیتا تھا جو دکھائی گڈریے کے بھیس میں
اُس نے بتایا کیسے پُر اسرار طور سے
شہزادہ ہوں ٹرائے کا پریام کا سپوت

شاہانہ تھے خیال، شہانہ تھی گفتگو
وہ مُہرِ ربطِ باہمی، بوسہ وہ اوّلیں
میرے کنوارے ہونٹوں پہ اُس نے کیا جو ثبت
باقی ہے آج تک مرے ہونٹوں میں اسکی آنچ
وہ باس بھینی بھینی وہ خوشبوئے خوش گوار
شاداب و تازہ ہے مرے لب پر اسی طرح
بوسے لئے ہزاروں ہی گو اس کے بعد بھی
ان ساعتوں کی یاد میں باقی ہے انگبیں
وہ بھولی بسری ساعتیں دل دار ساعتیں
سوندھی سہانی ساعتیں گلنار ساعتیں

(پہاڑی پر چڑھتے ہوئے پیرس کی آواز جو مدھم سنائی دیتی ہے)

اُف اُف الونی!

الونی :- اوہ یہ کیسی پکار ہے!
میرے حبیب کی یہ صدا تھی؟ نہیں نہیں!

پیرس :- (قریب تر)

اُف اُف الونی !

الونی:- مجھ کو تو آتا ہے خوف سا

پیرس:- (ظاہر ہوتے ہوئے)
اُف اُف الونی !

الونی:- کیا ہی نحیف و نزار ہے!
مجھ کو بُرے خیالوں سے للہ بچائیو!
(گھٹنوں کے بل اُٹھتے اور پیچھے مُڑتے ہوئے)
بارِ دگر تو اس جگہ آیا ہے کس لئے؟
کیا ختم ہے معاملہ ؟ پیرس کہو کہو !
کیا اب سکوں پذیر ہے اعصاب کا فشار ؟
کیا کٹ گئی ہیں تیری گرانبار بیڑیاں ؟
کیا تو فریبِ عشق سے آزاد ہو چکا ؟
اے پیاری رُوح آئی ہے دُنیا کو چھوڑ کر
کہہ لے تو تا کہ اپنی الونی کو الوداع ؟
گونجی ہے کان میں وہی آوازِ دل نواز
جو میرے واسطے کبھی فردوسِ گوش تھی

میرے حسین و مرمریں پیرس ابھی نہ جا
تو کیسے طے کرے گا عدم کی مسافتیں؟
جادے وہ تار و تیرہ و پُرخار و سنگلاخ!
تھا مرتعش ابھی ترے ہونٹوں پہ میرا نام
مجھ کو نہ بھولنا شبِ یلدائے گور میں
میں تیرا نقشِ پا تھی تری گردِ راہ تھی
قول و قرار تھے کبھی ہم میں بھی چاہ تھی!

پیرس:- (قدم بڑھاتے ہوئے)
مجھ سے نہ ڈر میں رُوح نہیں ماورا نہیں
میں گوشت پوست کا وہی پیرس ہوں دیکھ تو
زندہ ہوں میں ہنوز دھڑکتا ہے دل ابھی
ہو شادماں کہ بھڑکے جو شعلے میں آ گیا

انونی:- اے مسخرے نہ چھو مجھے نزدیک تر نہ آ
یہ باسی چاؤ چونچلے مجھ پر نہ آزما
نفرت ہے مجھ کو میری نگاہوں سے دُور ہو

پیرس:- پیرس ہوں میں انونی جو محبوب تھا ترا

یک لخت تجھ میں کیسا تغیّر یہ آ گیا؟
رس گھولتے ہیں کان میں چاہت کے بول ابھی

انٹونی:۔ بولے تھے تجھ کو مُردہ و آزاد جان کر
سمجھی تھی میں کہ رُوح مرے پاس آئی ہے
بندھن تعیّنات و علائق کے توڑ کر
ایسا کلام ورنہ میں کرتی نہ زینہار
تم نے مجھے ذلیل کیا، دی مجھے دغا
وہ لمحہ دل فریب تھا پر اب گذر چکا
مُردہ سمجھ کے تم کو پکارا تھا پیار سے
ٹُوٹا وہ سپنا اب تو سراسر ہو اجنبی
ہیلن کے پاس جاؤ کہ حق دار ہے وہی

پیرس:۔ زخمی ہوں مر رہا ہوں انٹونی ترس ترس!
اس شانے پر جہاں کبھی رکھتی تھی فرقِ ناز
تا سُن سکے تو ضرب دلِ بے قرار کی
ہوتیں سنہری کاکلیں بازو پہ منتشر
سانسوں سے سانس ملتے پھڑکتے لبوں سے لب
عین اس جگہ پہ چھیل گیا میرے گوشت کو

فیلوکٹی کے تیر کا پھل زہر میں بجھا
معمولی سی خراش یہ گو دیکھنے میں ہے
پر تن بدن میں جانکنی کی ہے کیفیت
رگ رگ میں ایک آتشِ بے دُود شعلہ زن
یہ آگ تو نہ ہو سکے دریا سے بھی فرد
بینارہ نور کا ہے تری ذاتِ پُر صفات
ہیں آشکار تجھ پہ نباتات کے خواص
تو چاہے تو شفا مجھے کر سکتی ہے عطا
سختی سے یُوں نہ بول اَنونی ہوں ملتجی
تو قلزمِ نوال ہے میں ایک مستمند
تو شاہِ بے نیاز میں درویشِ درمند!

انونی :- ہیلن کے پاس جاؤ کرو اس سے التجا

پیرس :- اس کا نہ نام لو، ہے عذاب اس کا تذکرہ
ہوتا نہ میں روانہ کبھی اس سفر پہ کاش
اس بحرِ لاجورد پہ کھلتے نہ بادباں
انجام اس ظفر کا بالآخر شکست تھا
طوفان کاش مجھ کو ڈبو دیتا بحر میں

بنتا کسی نہنگ کا طعمہ یہ نامراد
اے کاش چھوڑتا نہ اُڈا کی فضاؤں کو
یہ گلُ زمین یہ سلسلہ کہسار کا یہ گھر
یہ ساج، باج، کیس، کی رنگین سر زمین!
رُسوا ہوا خراب ہوا مبتلا ہوا
وہ کونسی گھڑی تھی جو تجھ سے جُدا ہوا!

انونی:۔ ممکن نہیں ہے جال کو بُن کر، اُدھیڑنا

پیرس:۔ آلہ بنایا اپنا مجھے دیوتاؤں نے

انونی:۔ دل کا تو بے وفا تھا چنا اس لئے تجھے

پیرس:۔ آوارگی کا اپنی مجھے اعتراف ہے
آخر تو دل کو مل ہی گیا گھر کا راستہ
خانہ خراب کو ترے دامن کی ہے تلاش
آتا ہے یاد مجھ کو زمانہ شباب کا
جب گونجتا تھا بانسری سے دامنِ اڈا
وہ سنسناتی آنچ وہ موسم بہار کے

تھک کر شکست و ریخت سے جنگ و نبرد کی
لیتا تھا آ کے جب تری آغوش میں پناہ
مری پکار سُن کے لکڑ ہارے رو پڑے
ان کو وہ نوجوانی کے دن یاد آ گئے
بجتا تھا جب کہ ڈنکا جلال و جمال کا
تھا ملکِ دلبری میں فتوحات کا چلن
مرتی تھیں مجھ پہ چمپئی چنچل کنواریاں
تپتے تھے گورے پنڈے مرے لمس کے لئے
ہونٹوں پہ راگ رنگ نگاہوں میں پھلجھڑی
ہر جلوہ میرے واسطے آغوشِ تنگ تھا
مجھ کو مگر تجھی سے انٹونی تھا واسطہ
میں تیرا شیفتہ تھا تو مجھ پر فریفتہ
اے چرخِ کہنہ، کاش یہ افسوں نہ ٹوٹتا!

انٹونی:۔ ہے! ہے! وہ عہدِ گُل وہ طلسمات کا سماں
پر پیچھے مُڑ کے دیکھنا اب تو ہے رائیگاں
وہ دن ہوا ہوئے وہ زمانہ گزر چکا

پیرس:۔ بے ہوش ہو رہا ہوں انٹونی علاج کر

انونی:۔ سو آج اعتراف ہے ہیلن کو عجز کا
باقی نہیں ہے بوسوں میں اب طاقتِ شفا
وہ چاہے چومے پیار کرے صد ہزار بار
دورانِ رنج و درد میں آتی ہے میری یاد
میں صرف کھولتی ہوں تیری خواہشوں کا دِلہ
کیا فائدہ مگر مجھے اس کاروبار سے؟
چبھتی ہے ایک پھانس سی سینے میں رات دن!

(اپنی چھاتی پیٹتی ہے)

پیرس:۔ اے بختِ تیرہ!

انونی (اپنے آپ سے)
میں اسے برداشت کر نہیں
سکتی زیادہ دیر!

پیرس:۔ پسیج اے جفا سرشت
قدموں پہ تیرے خم ہوں مری پستیوں کو دیکھ
قدموں پہ تیرے مرتا ہے پیرس خیال کر
سوتا وہ عشق و رحم کا تو خشک ہو چکا
پیرس کے جیتے جی گئے وقتوں کو یاد کر

ماضی کو دیکھ حال کی حالت کو بھول جا
اک بار ان سموں کو انٹونی تو یاد کر
جب کھیلتے تھے عشق و جوانی کے کھیل ہم

انٹونی:۔ نقش و نگار ان کے ہیں سینے پہ مرتسم
وہ لمحے نرم و نازک و شفاف و بے قیاس
جن کو بُنا ہماری مسرت کے واسطے
مشاطۂ ازل نے حریر و سمور سے
کھو کے ہوئی ہیں ان کی حلاوت سے آشنا
کن قیمتوں پہ ملتا ہے ہم کو شعورِ عیش
جب ہو کے بے نقاب دکھایا حیات نے
اپنا ترو ٹھا چہرہ ، بھیانک ڈراؤنا
یادیں یہ تازیانہ سی لگتی ہیں جسم پر

پیرس:۔ اے روزگارِ تیرہ و آشفتہ و دژم!
مجھ بے وفا کی خیرہ سری کا نظارہ کر
آفاق سے تھا بڑھ کے یہ یاقوتِ شائگاں
سمجھا جسے خزف، صدفِ پاک تھا وہ دل
اب تو نہیں مجھے کوئی جینے کی آرزو

حقّا میں مستحق ہوں اسی مرگِ تلخ کا
بس ایک بار مجھ پہ آنونی نگاہ ڈال
رنجش بھی اک ادا ہے مگر طور طور کی
بس ایک بار موڑ کے چہرے کو دیکھ تو
پیرس پہ ڈال ایک دمِ واپسیں نظر
جو شیفتہ ہے تیرا ہے تجھ پر فریفتہ

انونی:۔ (اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیتی ہے)
پیرس جیو ابھی تو ہیں کھل کھیلنے کے دن
کھولو نگاہ پیارے ہے میری زیادتی
آنکھوں کو کھول کے مری آنکھوں میں جھانک تو
روتی ہوں میں ترے لئے۔ زندہ رہے گا تو

پیرس:۔ (اپنی آنکھیں وا کرتے ہوئے)
مرتا ہوں تجھ پہ عاشق و دیوانہ ہوں ترا

انونی:۔ شیریں ہے یہ سخن

پیرس:۔ مجھے مرنے دو گود میں

انونی :- چنگا کروں گی میں تجھے زندہ رہے گا تو

پیرس :- مت رو انونی آنکھ سے آنسو تو پونچھ ڈال

انونی :- گرنے دو ان کو ملتا ہے دل کو سکوں یونہی
پیتم ملن کی آس میں کاٹی ہے زندگی
رنگیں زمانے لوٹے ہیں پلٹی بہار رُت
ہے میری چھاتیوں پہ ترا سر ٹکا ہُوا
پھر سے دل و جگر میں ہے میلہ لگا ہُوا۔

پیرس :- چومو مجھے انونی

انونی :- ترے ہونٹ سرد ہیں

پیرس :- (اُٹھنے کی بے تابانہ کوشش کرتے ہوئے)
لاؤ حیاتِ تازہ انونی مرے لئے

انونی :- (پیچھے ہٹتے ہوئے جیسے خوف زدہ ہو گئی ہو)
جاتی ہوں لا کے دیتی ہوں تجھ کو حیاتِ نو

(جانے کے لئے اُٹھتی ہے)

پیرس:- زندہ رہوں گا زندہ رہوں گا خوشا نصیب

الونی:- (جاتے جاتے پیچھے پلٹ کر دیکھتی ہے تو اس کا چہرہ نظر آتا ہے)
آہ آہ، تیرے چہرے پہ ہے خندۂ عجیب
مظہر نہیں یہ عشق و محبّت کا مان تو
یہ سرد ہے، ہے اس میں جھلک اعتماد کی

پیرس:- (تحکمانہ)
کیوں رُک گئیں الونی، کہاں ہے وہ زندگی؟

الونی:- اندھی ہوں۔ بیوقوف ہوں میں سادہ لوح ہُوں
وہ میرا خواستگار نہیں صاف ہے عیاں
اس کو مری نہیں ہے طلب زندگی کی ہے

پیرس:- کیوں چُپ سی ہو الونی

الونی:- ذرا پھر سے مسکرا
ہے تیرے مسکرانے میں نفرت کی بازگشت

اب چارہ ہی نہیں کوئی نفرت کئے بغیر
ہو جاؤں گی وگرنہ میں پاگل نری پُری
اے میرے دل ہے یہ مری برداشت سے پرے
اس کو نہیں ہے مجھ سے محبّت نہ تھی کبھی
اُس نے کبھی نہ مجھ کو سمجھنے کی سعی کی
پس چکنی چپڑی باتوں سے دیتا رہا فریب
کمزور رگ مرے دلِ ناداں کی چھیڑ کر
مقصد وہ چاہتا تھا کہ اپنا نکال لے
کھیلے شہابی ہونٹوں پہ نفرت کا نوش خند
پھر لے ہلورے عشق کے ہیلن کی گود میں

پیرس:۔ سُن میری بات باولی!

انونی:۔ ہرگز نہیں نہیں!

پیرس:۔ ٹھہرو ذرا رُکو تو انونی

انونی:۔ نہیں نہیں!

(انونی دائیں سمت تیزی سے بھاگ جاتی ہے۔ پیرس اس کا

پیچھا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر نڈھال ہو کر گر پڑتا ہے)

پیرس :- برباد ہو چکی مری دُنیائے آرزُو
پیرسؔ کہاں تلک ملک الموت سے گریز؟
دم ہوتا بازوؤں میں تو کر لیتا خود کشی
چبھتی ہے سانس سینے میں اُٹھتا ہے دل میں درد
اب دوشِ ناتواں پہ ہے اک بار یہ وجود
جس سے تھی آس اُس نے بھی ٹھکرا دیا مجھے
اب خواہشِ حیات ہے سودائے رائیگاں
میں شاہزادہ ہوں ملیں مجھ کو محبتیں!
انجام ہے یہ سب کا کہ تنہا جئیں مریں
اے ظلمتِ مدام مجھے جلد ڈھانپ لے
میرا وجودِ زشت ہو نسیاً و منسیا
ہیلنؔ! نہیں اسے بھی فراموش ہی کروں
مجموعہ منتشر ہُوا نظمِ حیات کا
ہر چیز چھن چکی ہُوا جھوٹا ہر آسرا
کہتا ہے قلبِ زار ہر اک شے کو الوداع!

(نیچے اپنے خدمت گاروں کو آواز دیتا ہے)

کورونیس ، امانت ، شتاب ، آؤ میرے پاس
وہ آ رہی ہے کالی ، بھیانک ، ڈراؤنی
جس موت کو میں کہتا تھا ناقابلِ یقیں
بے دست و پا ہوں مجھ میں نہیں جنگ کی سکت
طاری ہے تن بدن پہ نقاہت سے تھرتھری
ڈستی ہے یاد عہدِ گذشتہ کی ہائے ری !

(کچھ وقفے کے بعد دونوں ظاہر ہوتے ہیں)

آؤ قریب لے چلو اُمید مٹ چکی !

کورونیس :- اے میرے شاہزادے !

پیرس :- مجھے لے چلو مگر
پیاسے ہیں میرے خون کے اہلِ ٹرائے تو
مرنے کے بعد نعش یہیں دفن کیجیو
اس خانماں خراب کو بچپن سے ہے بہت
دل بستگی اڈا کے نشیب و فراز سے
اہلِ ٹرائے سے متواتر بچائیو !
کھینچے پھریں نہ کوچہ و برزن میں لاش کو
دو حکم ان گڈریوں ، لکڑہاروں کو ذرا

تیار ان درختوں سے میرے لئے چتا
جھٹ پٹ کریں کسی وہ پس و پیش کے بغیر
یہ پیڑ یہ درخت مرے بچپنے سے ہیں
میرے رفیق و مونس و دمساز و غمگسار
سیٹی بجایا کرتا تھا بس ان کی چھاؤں میں
ہونے دو شعلہ زن انہی کو میری لاش پر

کورونیس:۔ تعمیل ہو گی۔

امانت:۔ رنج ہے ہم سب کے واسطے

کورونیس:۔ مجھے اس خبر سے پہلے ہی آگاہ دیوتا
تیار کر چکے ہیں وہ پہلے سے ہی چتا
سب نخلِ سر بلند زمیں بوس ہو چکے
شاید ہی کوئی پیڑ ہو کلہاڑوں سے بچا
کیا علم تھا بنیں گے وہ شہزادے کا سر پر

پیرس:۔ ان پر لٹا کے جھ کو اسی رات آگ دو

کورونیس:- عجلت ہے اس قدر!

امات:- پہ یہ مرنا بھی کیا ضرور!

پیرس:- زندہ ہی مجھ کو جھونک دو جلتے تنور میں
بھننے دو میرے تن کو بھڑکنے دو آگ کو
شعلے لپک کے اہلِ ٹرائے کو لائیں گے
سب لوگ دیکھنے یہ تماشا تو آئیں گے
ان کے کلیجے دیکھ کے ٹھنڈک تو پائیں گے
اے مرے سن سیدہ و حرماں نصیب باپ!
کر دل کو استوار اس اندوہ کے لئے
لائی ہوئی ہیں میری ہی ساری مصیبتیں
چھلکے گی پھر بھی میرے لئے چشم سوگوار
(ایک تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے)
رخصت ہے مجھ سے میری تواں آہ میں چلا
تھامو مجھے مگر نہیں تنہا ہی چھوڑ دو
ہیلن! مری پکار کا ہیلن! جواب دو!

(پیرس لڑکھڑاتا ہے خدمت گار اسے تھامتے ہیں اور آہستہ آہستہ نوحہ کناں راستہ کے نشیبی سمت اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ کچھ وقفہ کے بعد اَنونی کی کانپتی آواز سنائی دیتی ہے

وہ واپس آرہی ہے)

انونی :- پیرس کہاں ہو بولو۔

(جب کوئی جواب نہیں پاتی)

وہ بُوٹی لو یہ رہی

یہ میرے ہاتھ میں ہے تری زیست کی نوید

(ظاہر ہوتی ہے۔ پیرس کو ادھر اُدھر تلاش کرتی ہے تب مایوسی اور سکتہ کے عالم میں)

تنہا، کنارِ مرگ، اندھیروں میں یاس کے
میں نے کہاں دھکیل دیا بد نصیب کو
بے سُدھ کسی چٹان پہ ہوگا وہ کانپتا
طاری نہ اُس پہ عالمِ سکرات ہو کہیں
مجھ کو کوئی سہارا دو، کوئی سہارا دو!
چھائی ہے دُھند میری نگاہوں کے سامنے
مظلوم سے میں ظالم و بیداد گر بنی
دِتنا ہے وہ حسین و المناک و درد مند
پچھتاوے کے شکنجے میں دُکھتا ہے دل مرا
مجھ کو اگرچہ اس سے محبت نہیں نہیں
مرنے نہ دوں گی پھر بھی اسے یُوں میں زینہار
حالت تھی سوگوار مگر دل تھا شادماں

اب تو مگر ہیں ظاہر و باطن ہیں ایک ہُوں
ظاہر بھی نامراد ہے باطن بھی نا مراد
کنجِ لحد کی طرح ہے ٹھٹھری ہوئی فضا
پیرسؔ کہاں ہو کلبۂ احزاں کو لوٹ آؤ!

(آخری بول بولتے ہوئے وہ دائیں سمت جھاڑیوں میں اُسے تلاش کرنے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ ہیلن سیاہ لباس میں دور درختوں میں سے نمودار ہوتی ہے)

ہیلن:۔ اک فاصلے سے شعلے دکھائی دیئے مجھے
ان ہی درختوں میں وہ بھڑکتے ہوں جس طرح
کوندیں ستیز گاہ میں تلواریں جس طرح
دوشِ ہوا پہ آہ و بکا کی صدائیں ہیں
تنہائی ہے سکوت ہے اک ڈھیر راکھ کا
ماتم گسار نالہ و شیون میں محو ہیں
اُلجھے ہوئے ہیں بال، گریباں دریدہ ہیں
ہیلنؔ کا ساتھ چھوڑ کے پیرسؔ کہاں گیا؟
پروا نہیں وہ کس جگہ روپوش ہو گیا
اب تو نکل کھڑی ہوئی اُسکی تلاش میں
چھپتا ہے گمشدہ سے کوئی گمشدہ بھلا؟
تلووں میں ٹیس سے اُتر آیا ہے گو لہو

لیکن رہوں گی متّصل اُس کے سراغ میں
وابستہ مرگ و زلیست ہے اب تو اسی کے ساتھ
اس کے بغیر شہر ٹرائے اُجاڑ ہے!

انونی :- (باہر سے اس کی چیخ سنائی دیتی ہے)
پیرؔس !

ہیلن :- پُکارتا ہے اسے کون اس جگہ ؟

انونی :- (جلدی سے ظاہر ہوتے ہوئے)
میں !
مل چکا ہے تم کو تو لاؤ اسے یہاں

ہیلن :- ہیلنؔ کے چہرے سے تو مگر آشنا نہیں؟

انونی :- آہ !

ہیلن :- آہ ! سُن کے نام مرا تو ٹھٹھر گئی

تھی تو ابھی تو شعلۂ جوّالہ کی طرح

انونی:۔ میں ہوں انونی!

ہیلن:۔ مُردے بھی جلتے ہیں وا دریغ!
ہے میرے دشمنوں سے یہ دُنیا بھری ہوئی

انونی:۔ آنکھوں سے دُور ہو کہ تجھے دیکھتی ہوں جب
سینے پہ لوٹتا ہے مرے ایک سانپ سا
ڈر ہے مجھے کہیں یہ مرا دل بدل نہ جائے
پہلے کی اس بیں سنگ دلی کر نہ آئے عَود
درکار ہے فقط مجھے پیرؔس کہاں ہے وہ؟
کہتی ہوں کیا جنوں میں میں خود جانتی نہیں
دیوانے کو حواس سے کیا واسطہ بھلا
پیرؔس ہی جلوہ ریز ہے میرے خیال میں

ہیلن:۔ پیرؔس کہاں؟

انونی:۔ گئی تھی اسے چھوڑ کر یہاں

طاری ہوئی غشی تو کہیں وہ لڑھک گیا
افسوس کیسا گوہرِ نایاب کھو گیا!
میں کھوج اس کا ہر جگہ لیکن لگاؤں گی
یہ وہ نبات ہے جو اسے بخشے گی شفا

ہیلن:- ان بوٹیوں میں رکھی ہے اکسیرِ زندگی؟
جب اس سے دیوتاؤں نے سایہ اُٹھا لیا
ہیلن سے انقطاعِ رہ و رسم کر چکا
کیا اس حشیشِ خشک سے حاصل ہے منفعت؟
آباد گھر جو تھا وہ عزا خانہ ہو گیا

(نیچے سے نالوں کی آواز سنائی دیتی ہے)

انونی:- وہ اس جگہ ہے
وقت گنوایا ہے میں نے کیا
آخر کو مل گیا مجھے اُس کا پتہ نشاں
اب دامِ مرگ سے میں کروں گی اُسے رہا

ہیلن:- جب کر چکو گی اس کو رہا تو پھر اس کے بعد؟

انونی :- جب کر چکوں گی اس کو رہا! اوہ اسکے بعد!
(اچانک ایک بدلے ہوئے طیش ناک تیور سے)
اس کے حضور تم ہی یہ لے جاؤ بوٹیاں

ہیلن :- ان پر نہیں مرا تو سرِمُو بھی اعتقاد

انونی :- یہ بوٹیاں پکڑ انہیں باندھ اس کے زخم پر
یہ چوس لیں گی زہر تو مل جائے گا سکوں
جلدی کرو کہ اس پہ تو عالم ہے نزع کا

ہیلن :- تم سے میں اسکی بھیک لوں ممکن نہیں ہے یہ

انونی :- یہ ارمغاں تمہاری نظر میں حقیر ہے
تم جو کہ لوٹ کر مجھے برباد کر چکیں
دس سال سے جو مجھ کو جلاتی ہو آگ میں
اس تحفے کو حقیر سمجھتی ہو یا خدا!
کرتا نہیں ہے تم کو کفایت یہ جاؤ جاؤ

ہیلن :- ڈرتی ہوں تجھ سے میں تو کرے گی مجھے ذلیل

انونی :- وہ مر رہا ہے جاؤ گنواؤ نہ وقت کو

ہیلن :- تو دو !

(مڑ کر وہ جانے کو ہے کہ دور ایک مدھم لو ہر لمحہ تیز تر ہوتی دکھائی دیتی ہے)

وہ کیا ہے آگ لگی ہے ٹرائے ہیں؟

انونی :- شہرِ ٹرائے وہ نہیں

ہیلن :- شعلے بلند ہیں
اشجار کا حصار ہے اُٹھتی ہے جس سے آگ
اس آگ کے چو طرفہ ہجومِ غفیر ہے
جنبش نہیں، صدا نہیں آہ و بکا نہیں
کیا ہو گیا ہے ساکت و صامت ہیں جیسے سب
وہ دیکھو آ رہے ہیں زن و مرد جُوق جوق
جھکتے جھجکتے ہوتے ہیں آ کے وہ سرنگوں

انونی :- یہ اِک چتا ہے جلتی ہوئی

ہیلن:- اس پہ کون ہے
وہ تو نہیں؟

انونی:- وہی ہے!

ہیلن:- (بوٹیاں پھینکتے ہوئے)
مصیبت میں گھر گئی

انونی:- ہونا وہ التہاب مرے گرد کا شکے

ہیلن:- وہ چیختے چنگھاڑتے مرے اس کے درمیاں
کرتے ہیں مجھ کو خیرہ مرے عشق کو تباہ
پیرس جو میرا تھا کبھی اب راکھ بن چکا
جس کے لئے عبور کیا بحرِ شور کو
جس کے لئے ہوئی ہیں زمانے میں روسیاہ

انونی:- ہیلن کرے گی آگ محبت کا امتحاں
ہونے کو ہے ہمارے دلوں کا مقابلہ
جا کے چتا پہ بوسہ تو لے جانے والے کا

اور اپنے بازوؤں میں مسافر کو بھینچ لے
جو زندگی کا ساتھ ہے چلتا ہے موت میں
یہ امتحانِ جذبِ وفا ہے چلو چلو

(ہیلن جھرجھری لیتی ہے اور چپ رہتی ہے)

اے شعلو! لے کے آتی ہوں ایندھن میں اپنے ساتھ
کب سے ہے بے قرار یہ دِل آگ کے لئے
پی کے نگر کی راہ گزرتی ہے آگ سے
آغوشِ عاطفت میں مجھے بھی لپیٹ لو
جو زندگی میں مل نہ سکا اب نصیب ہو
پیرس میں آ رہی ہوں مرا انتظار کر!

(الزی نشیب کوہ میں غائب ہو جاتی ہے ہیلن دہشت زدہ اُسے تکتی رہ جاتی ہے شعلے بھڑکتے ہیں اور نیچے سے ایک ملی جلی بلند چیخ سنائی دیتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

برزخ

گر کارِ تو نیک است بہ تدبیرِ تو نیست
ور نیز بد است ہم بہ تقصیرِ تو نیست
تسلیم و رضا پیشہ کن و شاد بزی
کیں نیک و بدِ جہاں بتقدیرِ تو نیست

پہلی پجارن ———————— ممنون
دوسری پجارن ———————— بلطیس

(ملکِ زنگ میں ایک ہیکل۔ دو پجارنیں ہیکل کے سامنے کھڑی ہیں۔ دروازہ بند ہے)

پہلی پجارن:۔ خفیہ معبد میں ہو گیا داخل
بادشہ سرزمینِ حبشہ کا
جسے عادت ہے حق جتانے کی
اپنا ہر چیز کو بتانے کی
دیوتاؤں کی بزمِ خلوت میں
وہ سرِ پُر غرور خم ہو گا
تنِ تنہا، بغیرِ خیل و حشم
خوف و دہشت سے کانپتا ہو گا

غیر مرئی خداؤں کے آگے
جن کی آواز کوند بجلی کی
لبِ گویا پہ لن ترانی ہے!

دوسری:۔ وہی آواز جو ڈراتی ہے!

پہلی:۔ جو نہ جانے کہاں سے آتی ہے

دونوں:۔ ہم محافظ ہیں بابِ ہیکل کی
کوئی آنے نہ پائے دھیان رہے
کیونکہ آواز کی حفاظت ہیں
جان دینا بھی ارجمند و گزیں
جان لینے سے بھی دریغ نہیں
جانِ پُرسوز ہو عزیز جسے
وہ ہمارے قریب مت پھٹکے
ہم محافظ ہیں بابِ ہیکل کی
ہمیں کہتے ہیں دیو داسی بھی

دُوسری:۔ در و بام لڑ آئے سے گوئیاں

جنگی باجوں کی آ رہی ہے صدا
شور ٹاپوں کا ، گونج نعروں کی
دوستو! دوستی کا پاس کرو
جاں بلب الوداع کہتے ہیں
اس صدا کا خروش و سوز و گداز
کلبلاتا ہے شہ کے کانوں میں!

پہلی :- ٹالنا اس صدا کا سہل نہیں
یہ تو سینے میں چھید کرتی ہے

دوسری :- ہے! یہ بے درد ضربِ نقّارہ
گھر اُجاڑے ، دُلہن کو رانڈ کرے
گاڑے جبل و ربد میں ناخون
ڈگڈگا کے لہُو دلوں کا پیئے!

پہلی :- کھلا دروازہ ، بادشہ نکلا!

دوسری :- غیر مرئی صدا ہوئی گویا؟

پہلی:۔ بادشہ !

دُوسری:۔ اور ادھر وہ شہ بانو !

(بادشاہ ہیکل سے نکلتا ہے۔ تو پجارنیں ہٹ جاتی ہیں۔ ملکہ بلطیس اس سے ملنے کے لئے آگے بڑھتی ہے)

بلطیس:۔ کہیں نہ آپ ملے، میں نے ہر جگہ ڈھونڈا
کہاں رہے شہِ ذی جاہ، میرے عالی جاہ!
شفق کے پردۂ نارنج میں چھُپا سُورج
سوادِ شب کا پھریرا اُفق پہ لہرایا
طلوعِ صبحِ جدائی کی آخری شب ہے
بچھڑ کے مجھ سے کل اپنے سفر پہ چل دوگے
کنارِ بحر پہ جنگِ ترِ دجنہ کی کھکھیڑ
کہ جس میں اپنے پرائے کا امتیاز نہیں
ہیں آلے زخم مرے، اے غمِ فراق نہ چھیڑ
کہ تازیانہ سی لگتی ہے نکہتِ نوشیں
رہوں گی راج بھون میں، میں کس طرح تنہا؟
وہ پرن کُٹی ہی اچھی ہے شیش محلوں سے

جہاں دلوں کے درکتے نہیں کبھی شیشے
نظر پہ پہرے نہیں، آرزو اسیر نہیں!
(ممنون خاموش ہے)

خموش کیوں ہو بتاؤ مجھے بھی کچھ ممنونؔ
ہیں مضطرب ہوں مجھے بھی شریکِ راز کرو
کہ خو نہیں ہے تمہاری سکوت و تنہائی!

ممنون:- ہیں دیوتاؤں کے تنہا رُو برُو!

بلطیس:- دُعا کے لئے؟

ممنون:- عجیب شے ہے دُعا بھی سکونِ دل کیلئے

بلطیس:- رہی ہوں ناصیہ فرسا کبھی کبھی میں بھی
کچھ اس خشوع و خضوع اور ایسی شدت سے
کواڑ جیسے کوئی زور زور سے پیٹے
پر اب زباں پہ کوئی حرفِ آشنا ہی نہیں
جگر سے آہ، لبوں سے فغاں نہیں اُٹھتی

وہ سوزِ عشق بنا ایک شعلۂ خاموش

ممنون:۔ بھڑک کے جو سرِ دامانِ عرش کو چھُو لے
دُعا سے منزلوں آگے

بلطیس   تو دیوتاؤں نے
تمہارے دل کی حکایاتِ خونچکاں سُن لیں؟

ممنون:۔ وہ محض سنتے ہیں، لیکن ہماری قسمت کی
نوشت .یں کوئی ردّو بدل نہیں کرتے

بلطیس:۔ صدا میں شعبے ہیں دُوری کے خوف آتا ہے
تمہاری بات سناں بن کے دل میں چبھتی ہے

ممنون:۔ سُنو!

بلطیس:۔ صدا یہ تو نقارۂ وغا کی ہے

ممنون:۔ جلی اشارہ ہے فوجوں کے جمع ہونے کا

بلطیس:- وہ وقت آ ہی گیا ڈولتا تھا دل جس سے
مگر ان آخری لمحوں کو کیوں کریں برباد
صفِ مصاف تو نعمت کدہ ہے شاہوں کا
لہو، غنیم کا ہوتا ہے شیرِ نر کی غذا
کلاہ نور کی چھینو فرازِ فرقد سے
ظفر جلو میں چلے، فتح ہم رکاب رہے
کرو یہ اس کو فراموش میری خاطر سے
اگر زیادہ نہیں تو بس اک پہر کے لئے

(وقفہ)

میں پوچھتی ہوں کہ ایسی بھی رازداری کیا
جھنجھوڑتا ہے کوئی دل کو ہول آتا ہے

ممنون:- یہ میرے دل میں تو پوشیدہ کوئی راز نہیں

بلطیس:- تو پھر تم اپنے لبوں کو سیئے ہوئے کیوں ہو

تمہارے چہرے پہ گہرے دبیز سائے ہیں
مرے وجود میں کیا درد کا علاج نہیں!
نشاطِ رُوح نہیں دفعِ اختلاج نہیں؟
کہیں سے آئی ہے ناخوش گوار کوئی خبر؟
مجھے بتاؤ مجھے بھی شریکِ حال کرو
ہر ایک شے کی مجھے طاقتِ تحمّل ہے
سوائے اس روشِ اجتناب و اخفا کے

ممنون:- نہیں کوئی سخنِ گفتنی، مشیّت کا
جو امر ہے اُسے بس ماننا ہے سہنا ہے!

بلطیس:- نہیں وہ پہلے سے تم، کس نے کی یہ تبدیلی؟

ممنون:- وہی ہوں اور اسی طرح مُسکراتا ہُوں!

بلطیس:- لبوں سے حرف، نگاہیں ہیں سوچ میں ڈوبی
یہ کیسی سوچ ہے کیا فکر ہے نہیں معلُوم
یہ جانتی ہُوں فقط میں وہاں نہیں موجود!

ممنون :-   (توقف سے)

بساطِ ذہن پہ تحت الشعور سے اُبھرا
ہوا ہو خواب کوئی جب مسلّط و حاوی
ہر ایک چیز ہو مبہم، خلط ملط، دُھندلی
حواس ہوں نہ ٹھکانے، دماغ مختل ہو
اس ابتری میں دبے پاؤں صبح آ نکلے
کبھی مشاہدہ تم نے کیا ہے اس کا بھلا
کہ آشناؤں کے چہرے بھی غیر لگتے ہیں
اس اختلال میں اس جلوہ گاہِ رؤیا میں
حقیقتوں سے زیادہ فسانہ بھاتا ہے
ہر آن چڑھتے اُترتے گمان ہوتا ہے
اُلانگ آئے ہوں جیسے حدِ زمان و مکاں
کہ ایک خواب سے بیدار دُوسرے میں ہوئے
بدن سے ذہن کا رشتہ ہو منقطع جیسے
عجب معاملہ میرا، عجیب حالت ہے
میں دیکھتا ہوں تمہیں، جانتا ہوں ملکہ ہو
ہے ان کلائیوں کا گیسوؤں کا مَس ممکن؟
کہ تم ہو دُور کی دُنیا جو چھن چکی مجھ سے؟

یہ جسمِ تازہ و شاداب ہے کہ نسمہ وطیف!
کبھی جو جانِ جہاں تجھ سے وہ اجنبی ہوئے حیف!

بلطیس:- نہ جاؤ رُوح کی آغوش سے نکل کے کہیں
یہ کس طرح کا پریشان خواب دیکھا ہے
کہ جس نے ہوش و خرد کو کیا جنوں آمیز!

ممنون:- (وقفے کے بعد ——— اچانک)

مری حرم ، مری بیگم !

بلطیس:- (اس کے بازوؤں میں سماتے ہوئے)
یہ دل کی ہے آواز!
میں اس پکار پہ لبیک کہتی آتی ہوں
مجھے جکڑ لو کہو میں تمہیں عزیز نہیں؟

ممنون:- عزیز تر ہے محبت، دو چند کھونے پر

بلطیس:- یہ کھونے پانے کا کیا ذکر

اور آنکھوں میں

یہ اب بھی سوزِ نہانی کی روشنی کیسی؟

تمہاری ہوں میں صنم، تا ابد تمہاری ہوں

یہ ڈھیر ریت کے یہ مرمریں طلائی کلس

یہ زر نگار کبوتر، ترنجِ دست افشار

یہ دُرجِ لولوئے مکنوں یہ کاسۂ میگوں

یہ گہری نیلی آنکھیں، یہ سُنبلیں زلفیں

یہ ساق کیلے کی گُھنڈتھل، یہ بال بھونرے سے

یہ سب تمہارے ہیں، ان میں جو خون بہتا ہے

جو سانس چلتی ہے، جو جان پھڑپھڑاتی ہے

ہیں سب تمہارے، تمہارا رواں رواں میرا

تمہارے بن دلِ آشفتہ کا ٹھکانا کیا؟

ممنون:- (کورانہ جنبش کرتے)

میں اپنے ہاتھوں سے ہر عضو چھو کے دیکھوں گا

کہ اس طرح دلِ تشنہ کو اعتبار آئے

کہ یہ خیال نہیں، مادی حقیقت ہے

بلطیس:- یہ میں ہوں میں مرے پیارے، یہ جسم میرا ہے

یہ لفظِ گمشدہ سے اب بھی خوف آتا ہے

ممنون:۔ یہ نرم گرم دھڑکتا ہُوا تنِ سیمیں
جو میرے بازوئے سنگیں میں کسمساتا ہے
یہ سیب سونے کے یہ گول گدگدے نارنج
حریمِ حسن و جوانی کے مُرغِ دست آموز
حبابِ قلزمِ کافور ——— نُور کے قمقمے
یہی ہے زندگی شاید، ابھی میں زندہ ہُوں!

بلطیس:۔ یہ گفتگو تو مجھے چیستان لگتی ہے

ممنون:۔ میں زندہ ہُوں، نکل آیا ہوں سحر سے باہر
میں زندہ ہُوں!

بلطیس:۔ یہ بتاؤ وہ سحر کیسا تھا!

ممنون:۔ تھے یخ زدہ رگ وپے، بند خون کا دوران

گراں تھی مجھ پہ تنفّس کی آمد و شد بھی
پہ اب میں ہر طرح آزاد و شاد و فرحاں ہوُں
ترے بدن کی حرارت سے لوٹی زندہ دلی!
قدم گڑے تھے، ہو جس طرح پا بگِل کوئی

بلطیس:۔ کہو کہو کہ یہ سینے کا بار ہلکا ہو

ممنون:۔ میں مانتا ہوُں کہ یہ تھا اک اختلالِ قوا
بدن کا ضعف کہو یا نقاہتِ ذہنی

بلطیس:۔ گئے تھے بہرِ دعا اندرونِ ہیکل کیا
درِ قبوُل پہ جا کے ڈھئی دُعا نے دی؟

ممنون:۔ گیا نہ قصدِ دُعا سے، دُعا اگرچہ کی

بلطیس:۔ تو کیا تھا رازِ دلی؟

ممنون:۔ یک بیک خیال آیا

تمام تر جبریت ہے کاروبارِ جہاں
ہر ایک فیصلہ حتمی، ہر امر لابُدی
جو ہونہار ہے وہ ناگزیر ہوتا ہے
نہیں ہے اس سے کوئی مامن و مناص و مفر
میں سوچتا تھا لڑائی میں جا کے شامل ہوں
کہ رنگ محلوں میں آنند شانتی سے رہوں
اور اس سمے مجھے دھیان آیا دیو بانی کا

بلطیس:۔ تو کیا خبر ملی، کیا لب کُشا ہوا کاہن؟

ممنون:۔ کلام اس نے کیا
(دونوں الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ بولتا ہے)

تھا اندھیرا ہیکل میں
میں اس اندھیرے میں جا کے کھڑا ہوں چُپ چاپ
لبوں پہ مُہرِ خموشی تھی، گوشِ شُنوا تھے
پہ رفتہ رفتہ یہ سناٹا سانس لینے لگا
دھوئیں سے جسم بنا، جسم میں ہوئی ہل چل
مجھے لگا کہ مقیّد ہوں قعرِ زنداں میں

اگرچہ اس کی بنا، سنگ و خشت و گل سے نہیں
سمندروں کا تلاطم، سکوں پہاڑوں کا
ہیں خوف و دہشت و حیرت سے بیدم و درو‌ا
صنم کدے میں ہو بُت جیسے سنگِ مرمر کا
کہ جیسے شیر کے دیدے ہُوں دو دہکتے ہوئے
سوادِ دشت میں، کہسار کی ترائی میں
غزال جن کے تصور سے کانپ اُٹھیں
اسی طرح ہی بعینہ یہ گھورتا تھا مجھے
لہُو کی بُوند بدن میں، نہ ہاتھ پاؤں میں دم
یہ بدحواس میں نکلا ہوں کنجِ معبد سے
کہ چلتا پھرتا ہُوا جیسے کوئی لاشہ ہو
جہاں مجھے نظر آتا تھا ایک خوابِ رواں
تو آ گئی، مرے کانوں میں گونجے بول ترے
نہ گوشت پوست کا پیکر نہ مجھ کو لگتی تھی
ستوں ہو جیسے کوئی دُرّ و لعل و مرجاں کا
جو ہاتھ لگنے سے میلا ہو، درشنی ہو فقط!

بلطیس:۔ دروغ و ہرزہ نکلتی ہے دیوِ بانی بھی
ہمیشہ سے بنی آدم کی آرزوؤں کی

ہنسی اُڑاتی ہے اور اُن کا منہ چڑاتی ہے
کبھی پہیلی مکرنی میں بات کرتی ہے
کہ لفظ اچھے ہوں مفہوم خوش گوار نہ ہو
بُرے ہوں لفظ خوش آیند ہو مگر تعبیر

ممنون:- خموش پیڑ لرزتے، ہوا سنکتی ہے
یہ عطر بیز ہوا پھر سے مجھ کو دیتی ہے
وہ کلپنا وہ تمنّا وہ کامنا وہ تپاس
وہ سوتے جاگتے جذبوں کا کیفِ فردوسی
ملا شعور مجھے اور عطا ہُوا عرفان
کہ اس جہاں میں کوئی چیز بھی نہیں قطعی
ہر ایک شے گزَراں، عارضی، اضافی ہے

بلطیس:- یقین رُوح کا تو شہرِ دل میں ملتا ہے
ادا شناسِ محبّت، غم آشنا دل میں!

ممنون:- میں ہمنوا ہوں تمہارا، مقولہ یہ سچ ہے
میں اس سے پہلے غلامِ قضائے مبرم تھا
پہ لوٹ آئے دل و ذہن میں شکوکِ عزیز

میں پھنس گیا تھا شکنجے میں نااُمیدی کے
پہ سُن کے تیری نگاہوں کے ساحرانہ کلام
دہکتے شبنمی ہونٹوں کا سوم رَس پی کر
ہُوا یہ علم کہ اک قادرِ علی الاطلاق
جسے زمانہ کہیں، خالقِ زمانہ کہیں!
وہی ہے مصدر و سرچشمۂ قضا و قدر
حیات بخشِ نبات و جماد و جنّ و بشر
وہ چتر کار ہے ہم لعبتانِ نُطعِ وجود
وہی عزیز بنائے، وہی ذلیل کرے

بلطیس:- کنارِ چرخ پہ دیکھو، نیا ستارہ اُگا
حیات ہر گھڑی مصروفِ آفرینش ہے

ممنون:- ہُوا نصیب بالآخر سکونِ رُوحانی
قرارِ دل بھی عجیب و غریب نعمت ہے!

بلطیس:- نشاطِ خاطرِ بیتاب و مضطرب آؤ!

ممنون :- کہاں ہیں نورِ نظر میرے، شاہزادے مرے
وہ خواب گاہ میں داخل نہیں ہوئے ابھی کیا؟
ہم اُن کے پاس چلیں، چل کے اُن کو بہلائیں
تڑپ ہے دل میں مرے، ان سے باتیں کرنے کی
میں اُن کو دیکھے بغیر آج سو نہیں سکتا!
عجیب طور سے جاگی ہے شفقتِ پدری!

(جونہی ممنون و بلطیس نکلتے ہیں۔ دونوں پجارنیں آہستہ آہستہ لوٹ کر معبد کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں)

پہلی :- رات چھائی ——— پھر آئی تنہائی!

دُوسری :- اے دلِ بے قرار مت گھبرا
جھُوٹی آشاؤں کے فریب نہ کھا
زندگی رنجِ دمبدم ہی تو ہے
فرصتِ انتظار و غم ہی تو ہے
دلِ ناشاد و چشمِ نم ہی تو ہے

پہلی:۔ یہ چمکتے ہوئے ستارے ہیں!
یا لبِ آسماں کے تب خالے
ان کے ہونٹوں پہ بھی وہی آواز!

دوسری:۔ وہی آواز، ہائے قسمت کی!

(پردہ)

مُشتِ شرر

ہماں بہتر کہ لیلےٰ در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگ نائے شہر تابِ حسنِ صحرائی!

دایہ ——————— لیلےٰ

(صحرا میں خیمۂ لیلےٰ نصب ہے۔ اس کے سائے میں
دایہ کھڑی ہے۔ لیلےٰ اندر ہے)

دایہ :- یہ ہے وہ بادیہ ، وہ بیابانِ ہولناک!
ہو جائے آب آب جہاں زہرہ عشق کا
ہیں ڈھیر استخوانِ شکستہ پہ ریت کے
ہو گمشدوں کا حافظ و حامی خدائے پاک!
ممکن ہے کیا گذارہ کسی ذی حیات کا
اس آتشیں اُجاڑ میں اس دیو لاخ میں؟

لیلےٰ :- (اندر سے)

مجنوں ! دوانہ کیا ابھی آیا نہیں دوا؟

دایہ:۔ لیلےٰ مری عزیز! نہ کر بے قراریاں
وہ آئے گا ضرور مگر صبر شرط ہے!

لیلےٰ:۔ گھبرا رہا ہے دل یہ نہ بہلے تو کیا کروں؟
ڈرتی ہوں نامراد کہیں ہو نہ جائے شق
ٹکرا رہا ہے پہلو سے کیا زور زور سے!
کیوں میرے دل میں خوف وخطر کا ہجوم ہے
بچھڑے ہوؤں کا واقعی ہو جائے گا ملاپ؟
حسبِ مراد ہو گی کبھی گردشِ فلک
بدلے گا چرخِ تفرقہ پرداز کا شعار؟

دایہ:۔ ہاں کیوں نہیں! پہ چھوڑ نہ دامن اُمید کا
خوف و رجا ملازمِ دربارِ عشق ہیں
بوندیں یہ اوس کی، خوشی نور آفتاب کا!

لیلےٰ:۔ مجھ کو نہیں خوشی سے سرِمو بھی واسطہ

ہوں میں نو آشنا فقط اسرارِ عشق کی
حاوی رگ و عصب پہ دل و روح پر محیط
جکڑا ہُوا ہے عشق کے پھندوں میں بند بند
اس کے علاوہ دہر میں رکھا ہے کیا بھلا
دل جس کا دم بھرے، طلب و آرزو کرے؟
ہے میرے دل میں لیکن اک اندیشہ جاگزیں
دایہ!

دایہ:۔ مجھ کو بتا مری لیلےٰ نہ کر حجاب
اظہار و اعتراف ہے درمانِ دردِ دل!

لیلےٰ:۔ اِک وہ بھی دَور تھا کہ محبت بہشت تھی
نکلے ہوئے بہشت سے ہونے ہیں سات سال
ارمان چاہ کے رہے ظلمات میں اسیر
آئی نہ اُن کو راس ہوا گلُ زمین کی
روشن رہے ستارے مگر ان سے دُور دُور
کرنیں شگافِ در ہی سے بس جھانکتی رہیں
بیت الحزن میں کون انیسِ دلِ حزیں؟
اشباح و خاطرات ہیں دمساز و ہم نشیں

خوابوں کے تانے بانے ہیں پشمین و پرشمیں
دیکھو نگاہِ غور سے جن کو تو کچھ نہیں

دایہ :۔ کس بات کا یہ خوف ہے لیلےٰ بتا مجھے!

لیلےٰ :۔ کیا زر نگار خواب نکلتے ہیں سچ کبھی ؟
ان سات سال میں مجھے ہر صبحِ سُرخ پوش
تھی آئنہ حقیقتِ نا خوش گوار کا
غنچہ نہ کھِل سکا کبھی صدق و خلوص کا
عشقِ نہاں پہ تہمتِ پوشیدگی رہی
یہ قدغنِ عفاف یہ تاکیدِ شرم تھی
آنکھوں سے مجھ کو دیکھ نہ سرگوشیوں میں کہہ
اخفائے رازِ عشق نجیبوں پہ فرض ہے
روتا رہا یہ جذبۂ بے اختیارِ شوق
میرے بدن کی خلوتِ تاریک و تار میں
رگ رگ میں جوڑ جوڑ میں یہ چیختا رہا
دایہ تو سُن رہی ہے ؟

دایہ:- سراپا نیوش ہوں
ہے خامشی عطش، سُخن آبِ حیات ہے!

لیلےٰ:- وہ اور ہیں ملے پہ بچھڑنے کے واسطے
کیوں چرخِ کہنہ درپئے آزار ہو گیا؟
کیا روزِ اوّلیں ہی پیامِ فراق تھا
کس دن کا اس کو لیلےٰ و مجنوں سے بیر تھا؟

دایہ:- اس ابتدائی دَور میں بچّے تھے تم ابھی
اس دن تری نگاہ سے پھُوٹی تھی جو کرن
اس کی چمک دمک مجھے اچھی طرح ہے یاد
وہ باپ سخت ظالم و جابر تھا جانِ من!
جس نے کہ دے دیا تجھے تحویلِ غیر میں

لیلےٰ:- مجنوں مرے اوائلِ طفلی کے راز دار!
تھا واقعہ شدید کمر جس نے توڑ دی
سچّی تھی چاہ تیری محبّت عیوز تھی
بستی کو چھوڑ دشت میں آباد ہو گئے
بیڑی کٹی جو پاسِ رسُوم و قیود کی

ضبطِ فغاں کی قید سے آزاد ہو گئی
دیوانہ وار مائلِ فریاد ہو گئی
بس بے گناہ لُٹ گئی برباد ہو گئی
روشن تھی آگ دل میں نزے، مری یاد کی
میں سایہ وار، جانِ حزیں! تیرے ساتھ تھی
پہنائے دشت میں کوئی شوہر نہ ساس نند
صحرا میں تو رہا پہ بگولا سا بے قرار
دن چین سے نفور تھے اور رات نیند سے
کرتا تھا رم تو حضرتِ آدم کی شکل سے
ساتھی پلنگ و آہو و گرگ و شغال تھے
تن ڈھانپنے کا شوق نہ اکل و شراب کا
ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تلوؤں میں آبلے
رُخسار نیلگوں تھے گریبان تار تار!
دایہ سُنا دوبارہ تو بتلا رہی تھی کیا؟

دایہ :- اکثر قریب آن کے رُکتے تھے قافلے
سنگ و کلوخ بچّے دوانے پہ پھینکتے
رِستا لہو بدن سے تو ہنس ہنس پکارتے

اس حالتِ تباہ میں دعوٰی ہے چاہ کا ؟
اے عشق باز ! کہ تری لیلےٰ کدھر گئی ؟
جو کھو چکا ہو خود کو بھلا کیا جواب دے ا
مستِ شرابِ عشق کا سرمایہ ہے جنوں
اندیشہ ہائے سُود و زیاں معتبر نہیں
ہر نوٹے اسکے ہاتھوں کو آ آ کے چاٹتے
چیتے چنور ہلاتے، مگس راں تھے شیرِ غاب
دیکھے ہیں دُور سے یہ زمانے کے انقلاب
مخدومِ وحش وطیر بنے خانماں خراب

لیلےٰ :- میں اور وہ تھا تنگیٔ آغوشِ ناز تھی
اس خلوتِ وصال میں کوئی مخل نہ تھا
دونوں نے ایک ساتھ طرب زارِ خواب میں
ہونٹوں پہ ہونٹ رکھے تھے وقتِ فشار تھا
لیکن یہ خواب پرتوِ خور سے بکھر گیا
خیمے میں دُھند پھیلی ہے چھایا ہے جھٹپٹا
بے طور ہو رہی ہے طبیعت ددّا بتا
ہو گا وہ خوش نظر بھلا کس اُور سے طلوع ؟

دایہ:- میں دیکھتی ہوں دور چٹانوں کے درمیاں
ننھا سا ایک چشمہ گلستاں کہیں جسے
پھیلی ہیں پتیاں گلِ خیری کی برگ برگ
نشیب و فراز سوسنِ ازرق کے پھول ہیں
اس کے علاوہ ہر جگہ شعلے ہیں ریت کے

لیلےٰ:- وہ چشمہ استعارہ ہے ینبوعِ عشق کا
دیتا ہے پیاسے پھولوں کو جو زندگی نئی
نکلے گا میرا چاند بھی چشمے کے پاس سے!

(وقفہ)

دایہ:- لیلےٰ وہ آ رہا ہے وہ مجنوں ہے دیکھ تو!

لیلےٰ:- دایہ نہیں نہیں! مرا دل تو خموش ہے
کس طرح میں اٹھاؤں گی بارِ نشاط کو؟

دایہ :- بدلا ہوا ہے وہ نہیں اگلا سا رنگ روپ

لیلےٰ :- آ تو رہا ہے ؟

دایہ :- کیوں نہیں ہے بے گماں وُہی
اس دل کے روگ نے اسے بوڑھا بنا دیا
ڈھانچہ ہے ہڈیوں کا نہیں ماس کا نشاں
آنکھیں دہک رہی ہیں کئی دن کی بھوک سے

لیلےٰ :- اُف پھٹ نہ جائے دل کہیں اندوہ و رنج سے
ہے وقتِ انبساط، کنارا قریب ہے
صہبائے پُرخمار پلاؤں گی میں تجھے
مینا کا ہے پیالہ صراحی ہے سونے کی
بے شک خدائے پاک مجیر و مجیب ہے

دایہ :- کنکر تپے ہوئے ہیں جلاتے ہیں پاؤں کو

لیلےٰ:۔ مجنوںؔ میں اپنے آنسوؤں سے انکو دھوؤں گی

دایہ:۔ آنکھیں ہیں سُرخ ان میں سمائی ہیں وحشتیں
ہے جسم ایک شعلہ جو لرزاں ہے دھوپ میں!

لیلےٰ:۔ میں اُس کی پیشوائی کو خود آپ جاؤں گی

دایہ:۔ میں ایک سایہ ——— حلقۂ بیرونِ در سہی
دُوں گی نہ میں دکھائی ——— خوش آمدید، مرحبا!

لیلےٰ:۔ اے عشق تھام میرے تنِ رعشہ دار کو
مجنوںؔ یہ مَیں ہُوں مَیں تری لیلےٰ، دلفگار!

دایہ:۔ وہ آ گیا قریب، نحیف و نزار سی
لرزش طنابِ خیمہ پہ محسوس میں نے کی
پرچھائیں اس کی ہو گئی داخل درونِ در

کوئی صدا نہیں وہ در آیا ہے خیمے میں
پھر بھی کوئی مکالمہ کوئی صدا نہیں!
اِک دُوسرے کی آنکھوں میں ڈوبے ہیں غالباً
اور کر رہے ہیں نوش وہ نوشینۂ نشاط
تنہائیوں کی تاک پہ جو جوش زن رہی
ملتے ہیں سینہ چاک بالآخر —— مآلِ کار!

(وقفہ)

اُٹھتا ہے دل میں وسوسہ، اب بھی ہے کیوں سکوت؟

لیلےٰ:- (بیتابانہ)
مجنوںؔ!

دایہ:- خدا بچائے اسے، ہو گیا فرار

دیوانگی و دشت کا حلقہ بگوش ہے!

لیلےٰ :۔ لوٹاؤ میرا سپنا، مرا خواب پھیر دو
جھانکا مری نگاہوں کی تاریک جھیل میں
کس گمشدہ بہشت کی اس کو تلاش تھی؟
کس بھولے بسرے خواب کا جویا تھا دلربا؟
بن دیکھے بولے پھر کہیں صحرا میں چھُپ گیا
مجنوں۔ سراب و واہمہ، لیلےٰ۔ خیال وطیف!
ہے اس جہاں میں کونسی شے کو ثبات حیف!
کھوئے گئے ہیں دونوں کہ دُنیا اُجڑ گئی!

دایہ :۔ اے ربِّ دوجہاں! مری بچّی پہ رحم کر!
مَے تھی عتیق و آتشیں راز و نیاز کی
نازک تھے شیشے دل کے سلامت نہ رہ سکے

ممکن ہے عاشقی کا شمار و حساب کیا
یعنی مساحتِ فلک انگشتِ دست سے؟
ہر تجربے کی حد سے وہ آگے نکل گئے

موجِ ہوائے نیم شبی میں گھُلی ملی
اِک دُوسرے میں مدغم و پیوست ہو گئی
آہِ جگر خراشِ محبّت و حبیب کی
آغوشِ کہکشاں میں ستاروں کی بزم میں!
دُنیا فقیر ہو گئی، گلزار لُٹ گیا!
جب تنگ نائے دل متحمّل نہ ہو سکے
سوز و گدازِ عشق و خمارِ نشاط کی
سمجھو گھڑی وہ قُربِ قیامت کی آ گئی
یہ دیکھنے سے پیشتر اے ربِّ دو جہاں!
میں نامراد کیوں نہ زمیں میں سما گئی!

شعلۂ گل

حسن بے پردہ زغمازئ عشق است حزیں
شورِ مجنوں ہمہ جا گفتہ کہ لیلائے ہست

لیلےٰ

قیس

مہدی

(۱)

قیس:۔ وہ نامراد جنہیں عشق نے دیا بن باس
طلسمِ ہوش ربائے جہانِ کہنہ کے
نگار خانے کو حمامِ باد گرد کہیں
دلوں کے راج دلارے اسیرِ سحرِ جہاں
رواں دواں بہ قفائے بتانِ حشر خرام
مقام و راہ سے آگاہ و بے نیازِ مقام
برہنہ، تشنہ، گرسنہ، ستوہ و سرگرداں
خرابۂ سحر و شام میں جنوں جولاں
ستارہ وار ہمیشہ بھٹکتے رہتے ہیں
ان آسمان و بیاباں کو اے خدائے جلیل
دیا جو بہرہ تب و تابِ عشق سے تو نے
انہوں نے لاد دیا مجھ پہ اپنا بارِ گراں

اُٹھائے پھرتا ہوں میں تیری کائنات کا سوز
غریبِ شہر کے مانند سوختہ ساماں
ہجومِ شوق کی یلغار اے معاذ اللہ!
یہ عاشقی بھی ہے کوئی بلائے بے درماں
دلِ نگار میں برپا ہے شورِ رستا خیز
اسیرِ سود و زیاں کو کہاں مجالِ گریز
قبائے شب پہ ستارے نہیں شرارے ہیں
جو دھیمی آنچ سے شب بھر سلگتے رہتے ہیں
نہ جلتے ہیں نہ بھڑکتے ہیں اور نہ بجھتے ہیں
خدا یگانِ جمال و خلاصۂ خوُبی
کہاں ہیں نقش و نگارِ سوادِ محبوُبی ؟
کہاں ہے میرے ختن کا غزالِ مست خرام؟
انیسِ خلوتِ غم ہے نمودِ اخترِ شام
مجھے جنوں سے ملا تحفۂ غمِ ایّام!

(۲)

قیس:- میں گھر پہ ٹھہرا مگر آگ بجھ گئی آخر
ہمارے گھر سے ہوا، میہمان، ہمسائے
اُٹھا کے لے گئے انبارِ ہیزم و خاشاک

مہدی:- میں دیکھتا ہوں ذرا ٹھہرو قیسؔ!
(آواز دیتا ہے)
لیلےٰ!

لیلےٰ:- (خیمہ سے)
جی!

مہدی:- تمہارے بھائی کو تیرہ شبِ زمستاں میں

ضرورت آن پڑی چوبِ خشکِ صحرا کی

لیلےٰ:- میں اپنے بھائی کو خوش آمدید کہتی ہوں

قیس:- میں بنتِ عم کی اس اُلفت کی قدر کرتا ہوں
خدا کرے یہ ہمیشہ فروغ گیر رہے

لیلےٰ:- (خادمہ سے)
اُٹھو اُٹھو اور ابھی جا کے لکڑیاں لاؤ
(خادمہ کے ساتھ چلی جاتی ہے
مہدی بھی اس اثنا میں جا چکتا ہے)

قیس:- وہ آگ لینے گئی ہے درونِ خیمہ سے
اس آگ میں ہیں سب اندازِ برقِ سینائی
متاعِ آگہی جس کو کہیں اثاث البیت
جنوں کے ہاتھ سے کب کا ہے خوانِ یغمائی
سکوں کا حوصلہ و طاقتِ شکیبائی
تو نذرِ آتشِ حرماں ہیں ایک مدت سے
وہ ایک شعلۂ جوّالہ جس کی حدت سے

مرے حواس جلے اور شباب راکھ ہوا !
مگر یہ آگ کی تقریب تو بہانہ ہے
دلِ ستم زدۂ ہجر نے بہ عیاری
جو حسنِ یار کے دیدار کو تراشا ہے
وہ بے نیاز یہ پیچیدہ راز کیا جانے
جو مستِ ناز ہو کیفِ نیاز کیا جانے

(لیلےٰ واپس آتی ہے)

لیلےٰ :۔ یہ لمحۂ زندگیٔ جاوداں سے بہتر ہے

قیس :۔ تمہارے دل میں بھی اُلفت کا شعلہ مضطر ہے؟

لیلےٰ :۔ یہ اپنے جیب و گریباں کے چاک سے پوچھو
جو میرے دل پہ گزرتی ہے میں ہی جانتی ہوں
فسانہ زا ہیں مری بے زبانیاں کیا کیا !
نگاہ کہتی ہے دل کی کہانیاں کیا کیا !

قیس :۔ امینِ راز ہے دردِ نہاں کی دل سوزی

اگرچہ حاصلِ غم کچھ نہیں بجز نالہ
بہائے جنسِ تمنّا ہے نقدِ آہ و فغاں
چراغِ عشق میں جلتا ہے نفتِ قلب و جگر
مگر یہ رنجِ گراں کب زمانہ ساز ہوا
یہ التہابِ تمنّا مجھے جلا دے گا
کہاں ہے رخصتِ اظہار و اذنِ نظارہ؟
ہوں اِک زمانہ سے مہجورِ منزلِ مقصود؟
کبھی اُٹھیں گے حجاباتِ شاہد و مشہود؟
مجھے بتا تو سہی کیا کروں کہاں جاؤں
کہاں پہ تشنگیٔ سوز و ساز بجھتی ہے؟
کہاں پہ ہوتی ہے چاکِ جگر کی بخیہ گری؟
کہاں پہ سوزِ دروں سے فراغ ملتا ہے؟

لیلےٰ:۔ میں پُوچھتی ہُوں کہ ریگِ رواں میں سِحر ہے کیا
جو تم کو بادِ بیاباں سے یُوں لگاؤ ہے؟
تمہارے شعر میں ذکرِ رمِ غزال ہے کیوں؟
یہ کس کا راز ہے جو مجھ سے یُوں چھپاتے ہو؟
حریمِ ریگِ رواں میں کسے بلاتے ہو؟

قیس:- جمالِ ریگِ بیاباں تمہارے قدموں سے
غزالِ دشت کی شوخی تمہاری آنکھوں سے
یہی ہے وجہ جو میں بے قرار رہتا ہُوں

(آگ کے شعلے قیس کے دامن
کو چھو رہے ہیں)

لیلےٰ:- (سراسیمہ ہو کر)
یہ خوفناک نظارہ! ذرا ادھر دیکھو

قیس:- (اپنی دھن میں)
سحر کے پردوں میں تم کو تلاش کرتا رہا
تمہارے جلوؤں کی رنگینیوں پہ مرتا رہا
نسیمِ مشک فشاں میں تمہاری خوشبُو تھی
لبِ صبا پہ تمہاری حکایتیں تھیں رواں
غزالِ دشت کی آنکھوں میں بارہا دیکھی
وہ دل نواز چمک جو تمہاری آنکھوں سے
انہوں نے آنکھ بچا کر کہیں چرا لی ہے
اسی چمک میں ہے وہ اذنِ خود فراموشی

جو مجھ پہ کافِ کشش بن کے چھائے جاتا ہے

لیلےٰ:۔ یہ آگ تم کو جلا دے گی، پھینک دو لکڑی

قیس:۔ اسی جنوں کی بدولت یہ نوبت آ پہنچی
کہ ہو گئی ہے بیاباں کی خاک دامن گیر
بنی ہوائے مغیلاں بھی حلقۂ زنجیر
اسی جنوں نے یہ سوزِ دوام بخشا ہے
یہ باغبانیٔ صحرا کا کام بخشا ہے

لیلےٰ:۔ یہ انتہائے جنوں ہے جنوں سے بھی زاید
نہیں تو بس کوئی احساس ہی نہیں شاید
یہ دیکھو آگ نے ہاتھوں کو سب جھلس ڈالا

قیس:۔ یہ آگ جس سے مرا سارا جسم جلتا ہے
رواں دواں ہے یہ بجلی سی جو رگ و پے ہیں
تمہارے ہاتھوں نے لیلیٰ تمہاری آنکھوں نے
تمہارے حُسنِ فروزاں ہی نے لگائی ہے
مرا تمام نشیمن ہی جل چکا جس وقت

کسی نے زُلفِ شکن در شکن کو لہرایا
سمندِ ناز کے جولاں سے ہو چکا برباد
تو ان کو سبزۂ پامال کا خیال آیا
جلا کے ذوقِ تماشا کو آتشِ رخ سے
چمن میں شاہدِ گلؔ نے جلوس فرمایا!

(بے ہوشی میں لڑکھڑاتا ہے۔
لیلےٰ بڑھ کر اسے تھامتی ہے!)

(۳)

قیس:- یہ آسمان و زمیں، بے سہاروں کی تسکیں
کسی شہیدِ وفا کو اماں ملی تو یہیں
ہیں میری پلکوں میں سائے گھنے گھنیرے سے
یہاں پہ گھومتا پھرتا ہوں منہ اندھیرے سے
مری حیات سراپا طلسم بیداری
مجھے سپرد ہوئی دشت کی نگہداری
نصیب ہے سفر اپنا، سفر نصیب میں ہے
ٹھکانا اپنا یہیں منزلِ حبیب میں ہے
نشاطِ نغمہ و رنگِ بہار تھی لیلےٰ
لطافتِ چمنِ روزگار تھی لیلےٰ
کہاں پہ چھپ گیا سنگِ مزار لیلےٰ کا؟
ہوا میں اڑتا ہے شاید غبار لیلےٰ کا!

یہ دشت و راغ، یہ کہسار کتنے سنگیں ہیں
یہ ابر پارے کسی کے لہُو سے رنگیں ہیں
میں اپنی گمشدہ لیلےٰ سے جا ملوں گا آج
اسی مقام پہ اپنا وصال ہو گا

آواز:- قیسؔ!

قیس:- یہاں پہ دشت میں آواز ہے یہ کس کی؟

آواز:- قیسؔ!

قیس:- یہ کون؟

آواز:- قیسؔ!

قیس:- مجھے قبر نے پکارا!

آواز:- قیسؔ!

قیس :- مجھے لحد سے پکارا ہے میری لیلیٰ نے
شگفتِ غنچۂ دل کی نوید آ پہنچی
فراقِ یار کی گھڑیاں خدا خدا کر کے
دوامِ وصل کی لذّت سے ہمکنار ہوئیں
وہ سامنے مری لیلیٰ جمال آرا ہے
سریرِ گُل پہ عروسِ بہار
(چٹان سے کود کر ہلاک ہو جاتا ہے)

آوازیں :- لیلیٰ ! قیس !
ہمارے ناموں سے صحرا کی وسعتیں گونجیں
نگاہِ اہلِ جہاں پردۂ غیاب و خفا
ہم اب بھی وسعتِ آفاق میں خراماں ہیں
ہم اب بھی حُسنِ گل و لالہ سے نمایاں ہیں
خدا نے زندگی بخشی ہے زندگی سے سوا !

آتشِ سوزاں

جنوں مستم بفصلِ نو بہارم می تواں گفتن
صراحی بر کف و گل در کنارم می تواں گفتن

سلیری
موزرٹ

پہلا منظر

(ایک کمرہ)

سلبری:- لوگ کہتے ہیں نہیں روئے زمیں پر انصاف
جیسے افلاک پہ اس جنس کی ارزانی ہو
جیسے اجرامِ سماوی ہوں عدالت اوصاف
یہ شہادت ہے مرے دیدۂ تر دامن کی
کسی عالم میں بھی چین اس دلِ رسوا کو نہیں
مرے سینے میں لڑکپن سے لگن ہے فن کی
عہدِ طفلی میں کلیسائے کہن سے اُٹھتی
وجد انگیز و فسوں خیز نوا ارغن کی

مجھے حیران بناتی، متکیف کرتی

نوجوانی، تپش آموزِ جنوں، طوفانی!
عہدِ نادانی و ہنگامِ گلاب افشانی
ہر طرف بُت کدے، ہر سمت ہجومِ خوباں
جب سناتا ہے درا دم جرسِ عمرِ رواں
کارواں چلنے کو ہے، بڑھنے کو ہے بزمِ جہاں
فرصتِ عیشِ گریزاں کو غنیمت جانو
رُوح کی پیاس بجھاتے پھرو شاداں فرحاں
ہے عبث فکرِ زیاں، دل کے نکالو ارماں
قافلے آئے پری زادوں کے اٹھلاتے ہوئے
پاؤں سے دولتِ کونین کو ٹھکراتے ہوئے
جام چھلکاتے ہوئے، شیشوں کو ٹکراتے ہوئے
شبِ دیجور کے ایوان کو مہکاتے ہوئے
مری قسمت میں مگر لکھی تھی ویرانی ہی
میں نے اس وقت کسی تارکِ دنیا کی طرح
چھوڑ کر عشرتِ امروز کی البیلی طمع
زندگی کو ہمہ تن وقفِ مزا میر کیا

کوئی سودا تھا اگر سر میں تو موسیقی کا
جی نہ لگتا تھا کسی چیز میں نغمے کے سوا
سخت تھا پہلا قدم، اور کٹھن پہلا سفر
غلبہ احساسِ ہزیمت پہ بالآخر پا کر
میں نے منزل کا نشاں، کسبِ ہنر ٹھہرایا
ابتدا میں تو میں اِک عام سا کاریگر تھا
گوش کو جس نے کیا ذوقِ شناسِ آواز
اور انگشتِ خمیدہ کو سراپا اعجاز
طے کئے مرحلے تہذیب و ادب کے کیا کیا
میں نے اصوات کا پہلے تو گلا گھونٹا، پھر
لاش کی طرح بم و زیر کو چیرا پھاڑا
ناپا آہنگ کو الجبرے کے قانونوں سے
علم و عرفاں کی کسوٹی پہ پرکھ کر سُر کو
ساز سنگیت کے ایوان کا در باز کیا
بے قرار آتشِ پنہاں سے مگر دُزدیدہ
بھری محفل میں کوئی لعل نشیں نو وارد
گفتگو کرتے ہوئے پہلے پہل جیسے ڈرے
شوق تھا بیش و کم نفع و ضرر سے بالا
نہ ستائش کا تقاضا نہ سرِ نام و نمود
کلفت و لذتِ تخلیق میں محو و مخمور

رات دن کلبۂ احزاں میں نوا سنجِ سرود
گرچہ آرام چھُٹا ، نیند اُڑی ، بھُوک مٹی
پر نتیجہ ، وہی موہوم تذبذب ، وہی کوفت
کمتری کا وہی احساس، وہی لیل و نہار
جلنے بھُننے سے بالانجام ہوئے صرفِ شرار
مرے نغمے، مرے افکار، مرے نقش و نگار
جو پلے نازسے گہوارۂ چشمِ تر میں
اور پیتے رہے اشکوں کا مفرّح مشرُوب
بے اماں شعلۂ پُرپیچ کی زد میں آکر
راکھ کا ڈھیر بنے، کو بہ کُو آوارہ ہوئے
جنھیں سیراب کیا خُونِ تمنّا سے وہ پھُول
کِھلے کم کم پہ شگفتہ نہ ہوئے خاطر خواہ
موتی مٹی میں ملے، دل میں رہی دل کی چاہ
کوئی فن کار کی خلوت کا سماں تو دیکھے!
پے بہ پے سوزِ دروں، دم بہ دم احساسِ زیاں
مستزاد اس پہ ملامت گریٔ اہلِ زباں
زندگی نام ہے شاید اسی مجبوری کا!

جب گلگت پردۂ ظلمت پہ نمودار ہوا

شاہدِ فکر کے چہرے سے اُٹھاتا پردے
ہاتھ میں خیمۂ مینا کی طنابیں تھامے
موہنی آنکھ میں، ہونٹوں پہ نشیلے نغمے
اسے دیکھا تو میں آموختہ بھولا اپنا
خود پسندی کا رہا زعم نہ خود بینی کا
بدلا اقدار و عقائد کا تمامی نقشہ
اور اک بندۂ بے دام و رضا جُو بن کر
میں نے متبوع و مطاع اپنا اسے ٹھہرایا
کھانے پینے کا رہا ہوش نہ سستانے کا
سوزِ پیہم سے مرا مغز دھواں دینے لگا
شوق کوشاں تھا رہِ علم میں مجذوبانہ
نالۂ نیم شبی، آہ سحر گاہی سے
آخر اُمیّد بر آئی دلِ جوئندہ کی
اور سنگیت کے سیّارۂ بے پایاں میں
مل گیا مجھ کو مقدّر سے مقامِ عالی
مسکراتے ہوئے شہرت نے پذیرائی کی
سینے لوگوں کے مرے ذکر سے پُرنور ہوئے
صفتِ مہر مبیں میرا نصیبا چمکا
پہنی اذعان و تیقن کی قبا وہموں نے

غم نے الطافِ فراواں کا دوشالہ اوڑھا
سب کلاونت مرے سامنے پانی بھرتے
گنی گندھرپ مجھے مجتہدِ فن کہتے
مجھ سا مے خوار ہو اور بادۂ سرجوشِ غنا
تو زمانے کے بکھیڑوں میں اُلجھنا کیسا؟
ذائقہ رشک و حسد کا نہ کبھی میں نے چکھا
کبھی جذباتِ رقابت سے نہ آلودہ ہوا
کینہ و بغض و کدورت سے بلند و بالا
اپنے ہم عصر نوا سنجوں کا مدّاح رہا
گرچہ پیرس میں بہت دھوم مچی پسنی کی
پر جلن میں نے کسی نوع کی محسوس نہ کی
نہ آئی جین کی تمثیل کی خوش آہنگی
ذرّہ بھر دولتِ تسکینِ دلی چھین سکی
ضبط و ظرف اس کا مسلّم ہے زمانے بھر میں
کون خود دار سلیری کو یہ طعنہ دے گا
کہ وہ مغلوبِ غضب ہو کے کبھی جینے جی
خاک و خوں چاٹتے کچلے ہوئے کیڑے کی طرح
طیش کھائے گا، کراہے گا، کڑھے گا بے سُود؟
لیکن اب تو علی الاعلان میں خود کہتا ہوں

شمع ساں رشک سے جلتا ہے سلیری کا وجود
کوئی بتلائے زمانے میں کہاں ہے انصاف؟
کون کہتا ہے کہ ہے چشم مشیّت بیدار؟
رائیگاں جہدِ گراں، سوزشِ پیہم بیکار
نہ مناجات، نہ منتر کوئی کام آتا ہے
مرا اقبال ترے سائے سے گہناتا ہے
نام تیرا ہے مرے سامنے چلتی تلوار!
اے پدر سوختہ تو ہے تو یہ دورانِ حیات
ایک میدان ہے ویران، سپاٹ، اے موزآرٹ!

(موزرٹ داخل ہوتا ہے)

موزرٹ:۔ تم نے پہلے ہی مجھے دیکھ لیا آ ہا ہا!
اور میں سوچ رہا تھا تمہیں چونکانے کا

سلیری:۔ تم یہاں! دیر ہوئی کتنی تمہیں آئے ہوئے؟

موزرٹ:۔ ایک لمحہ! تمہیں اِک چیز دکھانے کے لئے
میں تمہیں ڈھونڈھ رہا تھا کہ سرائے کے قریب

آئی آواز مرے کان میں سارنگی کی
جو عجب، مضحکہ انگیز و الم آگیں تھی
اسی آواز نے اب تک مجھے روکے رکھا
گا رہا تھا لبِ لرزاں سے اک اندھا بڈّھا
"مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند"
لیتا آیا ہوں اسے میں تمہیں بہلانے کو
اندر آ جاؤ!

(ایک نابینا پیر مرد سارنگی لئے داخل ہوتا ہے)

سناؤ کوئی موزرٹ کی شے

(اندھا بڈھا ڈون ژدان کا ایک لحن بجاتا ہے۔ موزرٹ فلک شگاف قہقہہ لگاتا ہے)

سیلیری:- اس خرافات پہ ہے طاقتِ خندہ تم کو؟

موزرٹ:- تم تو لیکن بڑے سنجیدہ نظر آتے ہو
میں بھی ہنستا ہوں ہنسو تم بھی سلیری آہا!

سلیری:۔ جائے خندہ نہیں یہ تو ہے مقامِ گریہ
کیا میں خاموش رہوں جب کوئی نا قدر شناس
کرے بے حرمتی رافیلؔ کی تصویروں کی؟
کوئی نا محرمِ فن سانگ بھرے دانتےؔ کا
تو میں اس مسخرے پن پر کہوں سبحان اللہ!
اے فلک تجھ پہ تفو ہے، ہو دفان اے اندھے!

موزرٹ:۔ لو اس انعام سے پینا مرا جامِ صحت!
(بڈھا چلا جاتا ہے)

تم برانگیختہ ہو پیارے سلیری اس وقت
اس لئے چلتا ہوں اب پھر کبھی حاضر ہوں گا

سلیری:۔ لانے والے تھے مگر تم کوئی شے میرے لئے

موزرٹ:۔ کچھ نہیں اک بڑی معمولی سی شے تھی کل رات
اپنے بے خواب۔ بچھونے پہ بیا کل لیٹا
غرق تھا قلزمِ افکار میں، جب تین خیال
دھیان میں چمکے کسی گوہرِ غلطاں کی طرح

پَو پھٹے میں نے کیا ان کو سپردِ قرطاس
چاہتا تھا تمہیں تکلیفِ سماعت دے کر
استفادہ کروں اک نکتہ شناسِ فن سے
لیکن اس وقت تو حاضر نہیں طبعِ عالی!

سلیری:- آہ موزرٹ مجھے سمجھے ہو سنکی تم بھی
ہمہ تن گوش ہوں تشریف تو رکھو پیارے!

موزرٹ:- (پیانو پر)
اِک ذرا ایسے نواگر کا تصوّر باندھو!
مجھ سے ملتا ہو مگر قدرے جواں تر مجھ سے
عشق میں پا بہ سلاسل بھی ہو آزاد بھی ہو
مہرباں شاہدِ گلفام ہو مینا چھلکے
چمپئی جسم کی خوشبو سے شبستاں مہکے
ذہن پرواز پہ مائل ہو طبیعت لہکے
اور ایسے میں اس آسُودۂ رنگ و بُو کو
دفعتہً موت کی پرچھائیں نظر آ جائے
لو سُنو

(بجاتا ہے)

سلیری:۔ لے کے یہ نایاب و گراں مایہ متاع
رہے اک ملگجے میخانے میں تم سرگرداں
اور اس اندھے کی سارنگی پہ سر دُھنتے رہے؟
کتنا دلچسپ ہے یہ فن وحقیقت کا تضاد!
کتنی تاریک ہے باطن میں یہ دنیائے حسیں
آہ موزؔرٹ بھی موزرٹ سے آگاہ نہیں!

موزرٹ:۔ تو کیا تم نے مرے نغمۂ تازہ کو پسند!

سلیری:۔ کیا تعمق ہے، جسارت ہے، ہنرمندی ہے!
تم تو موزؔرٹ خداوند ہو موسیقی کے
اور میں ہی نہیں سب اہلِ نوا کہتے ہیں

موزرٹ:۔ واقعی! شک ہے مجھے بھی کچھ کچھ!
اس خدائی سے شکم تو نہیں بھرتا لیکن

سلیری:۔ کیوں نہ ہم رات کا کھانا کہیں باہر کھائیں
"کیفِ شمسی" میں سرِشام ملیں ٹھیک ہے نا!

موزرٹ:- شکریہ، اب ذرا گھر جانے دو
تا کہ بیوی کو بھی بتلا آؤں
منتظر مری عشا پر نہ رہے
(چلا جاتا ہے)

سلیری:- راہ دیکھوں گا فراموش نہ کرنا ہرگز
نا اُمیدی کے کچوکے میں سہوں گا کب تک
مبتلائے غمِ بے صرفہ رہوں گا کب تک؟
اپنے رستے سے اسے اب تو ہٹانا ہو گا
لوح سے نقشِ چلیپا کو مٹانا ہو گا
اس کا جینا ہے ہمارے لئے پیغامِ فنا
ہم جو سنگیت کی دیوی کے نظر کردہ ہیں
خدمتِ نغمہ نوازی میں کٹا جن کا شباب
جن کا لے دے کے ہے دُھن بربط و قانون و رباب
کہیں اربابِ نوا، میر مغنّی جن کو
رت جگے سے جنہیں تارے نظر آئیں دن کو
ان کے بے گور و کفن لاشوں پہ دھرتا ہوا پاؤں
وہ ثریّا پہ پلک مارتے جا پہنچے گا
اور کچھ عرصہ اگر عمر کرے اس کی وفا

کچھ ٹھکانا ہے خداداد صلاحیت کا!
پائدان اس کا ہے اک کنگرۂ بام بقا
اس سے پہنچے گا کوئی فائدہ موسیقی کو؟
اس سے کچھ گیت کلا پر بھی نکھار آئے گا؟
عزت افزائی ترتیل و ترنم ہو گی؟
کوئی درجاتِ اغانی میں اضافہ ہو گا؟
مانگے تانگے کی چکا چوند کا پردم کتنا؟
بھاگ جاتے ہیں بگھر دم کو سہانے سپنے
کوئی وارث بھی نہ چھوڑے گا وہ ظالم اپنا

کہ کم از کم جو روایت کی حفاظت ہی کرے
اور یہ قافلۂ راہ و مقام آگے بڑھے
ایسے خود بیں کی نوا ہائے نشاط آور سے
پائدار ایسا کوئی فیض نہ حاصل ہو گا!

نہ لگیں پھل، نہ کھلیں پھول، نہ پھوٹیں شاخیں
یہ کوئی گن بھی ہے بالفرض تو مجہول و عقیم

کسی کرّوبِ لؤا زن کی طرح تازہ شمیم
نغمۂ فردوسِ بریں کے وہ سناتا ہے ہمیں
ہمیں، ہم جو ہوئے انسان ضعیف البُنیان!
دل میں بے نام سی چیٹک کی جلا کر شمعیں
آپ ہو جاتا ہے خورشید کی مانند غروب
جیسے دم بھر کوئی دم دار ستارہ چمکے
اور پھر ظُلمتِ آفاق میں گم ہو جائے

ایک دن بجھنا ہے اس شعلۂ مستعجل کو
کیوں نہ پھر اسکے بجھانے میں مدد دیں ہم بھی
جتنی جلدی وہ نگاہوں سے نہاں ہو اچھا!

یہ حسیں رختی تحفہ، مری ایزورا کا
حرزِ جاں جس کو بنے سال اٹھارہ بیتے
ہے یہ وہ زہرِ ہلاہل ڈرے افعی جس سے
بارہا قیدِ شب و روز سے جی گھبرایا!
اور ناقابلِ برداشت بنی یہ دُنیا!

ایک ہی میز پہ دُشمن کے مقابل بیٹھا
سینہ آماج گہِ وسوسہ ، دلِ رہنِ عنا
شوقِ حسرت زدہ آمادۂ ترغیب رہا
اور انگیختہ کرتی رہی مجرُوح انا
میں نے لیکن نہ دھرے کان نوائے دل پر
اور بچتا ہی رہا سازش و سرگوشی سے
یہ نہ باعث تھا کہ میں بزدل و کم ہمّت ہوں
اپنی توہین کا چنداں مجھے احساس نہیں
یا مجھے پیار ہے اس عالمِ آب و گل سے
لہلہاتی ہے دھڑکنے کی تمنّا دل میں
میں نے ہر بار پس و پیش کیا مرنے سے
جب کبھی موت نے آواز دی ، بولا ٹھہرو!
کیوں مروں ، زندگی شیریں ہے ، جہاں رنگیں ہے
اور زیر و بم الحان ، حیات آگیں ہے
کون جانے ابھی نادیدہ ہیں جلوے کتنے
کتنے نظارے تھرکتے ہیں ضمیرِ کُن میں
کیا دکھاتی ہے ابھی گردشِ دَوراں دیکھیں
رقصِ نالندہ سنیں ، نغمۂ جولاں دیکھیں!
فیض کا چشمہ کبھی ریت میں ہو سکتا ہے جذب

کیا خبر زمزمۂ رنگ کے سوتے پھوٹیں
شبِ تخلیق منوّر ہو چراغِ دل سے
شمعِ الہام سے کاشانۂ جاں روشن ہو!

بڑھنِ ثانی کوئی پیدا کرے ایسا شہکار
دلِ ویراں کو شگفتہ کرے جس کی جھنکار
تھا مرا دشمنِ جانی، مرا مہمان جس وقت
دل میں اس وقت خیال آیا کہ اے دل شاید
اس سے بھی کوئی کٹھن وقت کوئی سخت مقام
اس اہانت سے بھی بڑھ کر کوئی ذلّت کا پیام
اس عدو سے بھی عداوت میں فزوں خون آشام
کون کہہ سکتا ہے کس وقت کہاں مل جائے
جب مجھے اس سمِ قاتل کی ضرورت ہو گی
ٹھیک تھا میرا گماں، مل ہی گیا آخر کار
مجھ کو وہ دشمنِ جاں، جس کی نواسنجی نے
مرا ارمان کدہ تاخت و تاراج کیا
جس کے لحنِ ملکوتی نے سلا کر مجھ کو

دن دہاڑے مرا گھر، میرا نگر لُوٹ لیا
یہی وہ ساعتِ مسعُود ہے اے تحفۂ عشق
جب تجھے قیدِ گلوگیر سے آزاد کروں
اور اِک دوست کو اخلاص کا نذرانہ دُوں!

دُوسرا منظر

(کیفے کا ایک علیحدہ کمرہ۔ پیانو)
(موزرٹ و سلیری ایک میز پر)

سلیری:۔ شکنیں سوچ کی ماتھے پہ ہیں چُپ چُپ کیوں ہو؟

موزرٹ:۔ ہیں ؟ نہیں تو

سلیری:۔ مگر اتنا تو نمایاں ہے کہ تم
ہو گرفتار کسی کشمکشِ ذہنی میں
کھانا رکھا ہے مہیا ہے مئے احمر بھی
اور تم ہو کہ خم و پیچِ انا میں گُم سُم

نقشِ دِل باختگی، پیکرِ افسردہ دلی
نہ کوئی چٹکلہ بازی، نہ کوئی خوش گپّی

موزرٹ:۔ ٹھیک ہے میرے دل و ذہن میں ہے پختہ وہ پُر
مرثیئے کی، سحر و شام لگا ہوں جس میں

سلیری:۔ مرثیئے کی؟ یہ کہو کب سے ہُوا فکرِ رثا؟

موزرٹ:۔ مِن و عَن کرتا ہوں اک ایسی حقیقت کا بیاں
جس پہ ہوتا ہے گماں مجھ کو بھی افسانے کا
تین ہفتے ہوئے لوٹا جو میں گھر رات گئے
کوئی آیا تھا ملاقات کو معلوم ہُوا
رات بھر مجھ کو رہا دھیان اسی صاحب کا
کون وہ شخص تھا، کس واسطے آیا، مجھ سے
اس کی وابستہ غرض کون سی ہو سکتی ہے
دُوسرے دن وہ پھر آیا، میں مگر گھر پہ نہ تھا
اگلے دن کھیل رہا تھا پسرِ اصغر سے
کہ اچانک مجھے آواز پڑی باہر سے
اسی حالت میں جو دروازے پہ آیا دیکھا

یہیں نے اک شخص کہ کوشش بھی تمام اس کی سیاہ
اس نے دربار نشینوں کی طرح خم ہو کر
کسی پیرایۂ تمہید و تعارف کے بغیر
مجھے اِک نوحے کی تحریر پہ مامور کیا
اور خود نو دو گیارہ ہُوا، بہ جا وہ جا
یہیں تو فی الفور ہوا خامہ بکف، دست بساز
پہ دوبارہ نہیں آیا وہ سیہ پوش اب تک
چلو اچھا ہی ہُوا، ورنہ کوئی سہل نہیں
اپنی تخلیق سے بالجبر جُدا ہو جانا
ہو چکی اس کی تو تکمیل پہ ——————

سلیری :- کہتے جاؤ ؟

موزرٹ :- برملا کہتے ہوئے مجھ کو حیا آتی ہے

سلیری :- کیا ؟

موزرٹ :- کہ وہ مردِ سیہ پوش شب و روز مجھے
مبتلائے تپشِ سوزِ دروں رکھتا ہے

سائے کی طرح وہ کرتا ہے تعاقب میرا
کسی صورت، کسی تدبیر نہیں چھٹکارا
مضمحل ذہن، دماغ اخگرِ خاکستر پوش
متزلزل ہے توازن مرا، قائم نہیں ہوش
اور اس وقت بھی محسوس یہ ہوتا ہے مجھے
کہ وہ اس میز پہ بیٹھا ہے اور اس محفل میں
بن بلائے کسی مہماں کی طرح شامل ہے

سلیری:۔ یہ نری وہم پرستی ہے تمہاری موزرٹ
دامِ اوہام سے وجدان کو آزاد کرو
زیب دیتی نہیں آشفتہ بیانی تم کو!
یاد ہے مجھ کو بیومرک کہا کرتا تھا
مرے ہمدم مری اس بات کو پلّے باندھو
جب کبھی ذہن میں ہو فکرِ پریشاں کا ہجوم
کاگ شمپین کی بوتل کا اڑا دو دن سے
غمِ کونین کو میزانِ طرب میں تولو

موزرٹ:۔ ہاں بیومرک سے تھا رشتہ تمہارا محکم

اس کی خاطر ہی تو تصنیف کیا "تارارے"
واہ وہ ! یہ بھی عجب سرمدی شے ہے کوئی
ایک ہی جذبے کی ہے اس کی مرصّع کاری
ایک ہی رُوحِ رواں اس میں ہے جاری ساری
والہانہ میں تو اکثر اسے دُہراتا ہُوں
وقتِ سرمستی و رامشگری "لا لا لا لا"
کسی انساں کو بھلا زہر دیا تھا اس نے
یہ جو مشہورِ خلائق ہے کہو کیا سچ ہے؟

سلیری :- مجھے اس بات کے سچ ہونے میں لیکن شک ہے
تھا بعید اس سے کسی جُرم کا سرزد ہونا
کہ وہ خوش ذوق تھا حد درجہ طرحدار و ظریف

موزرٹ :- عبقری تھا وہ مگر میری تمہاری مانند
عبقریت کا دنائت سے علاقہ کیسا ؟
دونوں رجحان ہیں بالکل متناقض ، متضاد

سلیری:۔ تو یہ رائے ہے تمہاری ؟

(اس کے جام میں زہر ملاتا ہے)

جیو جم جم ، مری جاں !

لو یہ سیالِ ورع سوز و فرح بخش پیو!

موزرٹ:۔ جامِ صحت یہ میں پیتا ہوں تمہارا اے دوست

دونوں سنگیت کلا کے اُستاد ———

دونوں تیراک ہیں سُر ساگر کے

مادرِ نغمہ و آہنگ کے فرزندِ جلیل

ایک ہی پردے کے دو رُخ ہیں سلیری۔ موزآرٹ

ایک ہی راگ کے دو سُر ہیں یہ جاں دادۂ آرٹ

(پیتا ہے)

سلیری:۔ کیوں تُنک تاز ہوئے جاتے ہو ٹھہرو ٹھہرو!

جام چھلکا بھی گئے ، رازِ بقا پا بھی گئے

میں ابھی سوچ میں بیٹھا ہوں پیالہ تھامے!

موزرٹ:۔ (اپنا رومال میز پر پھینکتے ہوئے)

ہو چکا ہیں تو شکم سیر

(پیانو کے پاس جاتے ہوئے)

سلیری لو سنو

مرثیہ اپنا سناتا ہوں۔

(بجاتا ہے)

یہ آنسو کیسے؟

سلیری:۔ ڈبڈبایا ہے مرا دیدۂ تر پہلی بار
دیدنی ہے دلِ ناداں کی تلوّن کیسی
حالتِ وجد ہیں مخمور بھی رنجور بھی ہے
تلخ و غمناک کوئی فرض ادا جیسے کرے
عضوِ فاسد کو کوئی نشترِ مشفق کاٹے
آبگینہ سے مئے تند اُچھل جاتی ہے
چھیڑو مضراب سے تارِ رگِ جاں کو چھیڑو!

سرمدی لَے سے مری رُوح کو سرشار کرو
لبِ مطرب سے علاجِ دلِ بیمار کرو

موزرٹ:۔ کاش سب ہوتے تمہاری طرح آہنگ شناس
چھوڑ کر سود و سیاست کے سنہرے ہیکل
آدمی خالصتاً فن کی پرستش کرتے
مگر ایسے تو بگڑ جاتا زمانے کا نظام
کون پھر خود کو کھپاتا غمِ لاحاصل میں
انتظاماتِ معیشت میں پریشاں خاطر
روزمرّہ کے جھمیلوں میں اُلجھتا پھرتا
گلی کوچوں میں لٹاتا دلِ زندہ کی متاع
صرف کرتا نفسِ تازہ و نایابِ حیات
بہرِ جمعِ خس و خاشاک و پئے این و آں؟
ہم کہ ہیں منتخبِ عصر و وجدانِ زماں
شاہدِ آوارہ، شہیدانِ خیالات و بیاں
دامن آلودہ نہیں رکھتے افادیّت سے
ہم کہ ہیں مے کدۂ حُسن کے پیرانِ مغاں
غم نہیں ہم پہ اگر ہنستے ہیں اربابِ جہاں
ہم سے پائندہ ہیں تہذیب و تمدّن کے نشاں
ہم ہیں گلبانگِ درا، قافلہ سالارِ خیال
پاسبانِ حرمِ عاشقی و دیرِ جمال!
نہیں اس دولتِ فن کو کبھی نقصان و زوال

یعنی رہتے ہیں سدا رُو بہ فروغ اہلِ کمال
ہیں ہمیں اہلِ نوا خاصۂ خاصانِ خدا
یک بیک ہونے لگی سینے میں مالش کیسی ؟
دل ہے بے چین، بدن خستہ، طبیعت برہم
سرگرانی ہے کہ اک جان کنی کا عالم!
چلوں سونے کی ذرا چل کے کروں تیاری
شاید آرام سے یک لحظہ قرار آ جائے
الوداع !

(چلا جاتا ہے)

سلیری :- ایسی بھی کیا جلدی تھی ؟
اس طرح سوؤ گے بیدار نہ ہو گے زنہار!
دل میں اک شور سا ہے وہ کہیں سچا تو نہ تھا؟
عبقریت سے میں سچ مچ کہیں عاری تو نہیں
نابغہ ہوتا ہے وہ جو ہو نجیب الطرفین؟
چاہیئے اس کے لئے شان کے شایاں کردار؟
کیا دنائت سے ملاپ اس کا نہیں ہو سکتا؟

کیا ہیں اس قول کی تائید میں احوال وظروف
کیا کسی حجت و برہان پہ ہے اس کا مدار؟
اک ذرا یاد کرو قصۂ بوناپارٹ کو
کیا یہ افسانہ تراشا ہے کسی دشمن نے؟
کیا نہ قاتل تھا وٹیکن کا معزز معمار؟

حاشیہ

۱ ـــــ موزآرٹ والف گانگ اماڈیئیس (۱۷۵۶ - ۹۱)

آسٹریا کا موسیقار۔ سالبزگ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ لیوپولڈ موزآرٹ پیانو نواز تھا۔ اس کے سات بچوں میں سے صرف والف گانگ اور اس کی بڑی بہن ماریا آینا زندہ بچے تھے۔ نغمہ گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا ؎

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

چنانچہ باپ ان دونوں کو (۱۷۶۳ - ۶۶) پیرس اور لندن لے گیا۔ ۱۷۷۳ء تک والف گانگ تین مرتبہ ایطالیہ کی سیاحت کر چکا تھا۔ معاش کے لئے اس نے سالبزگ کے لاٹ پادری کی ملازمت کی۔ لیکن شکر رنجی کے باعث قطع تعلق کر کے ۱۷۷۹ء میں مستقل طور پر وی آنا میں آباد ہو گیا۔ اس کی اکتالیس سمفنیوں میں سے نصف سے زیادہ صرف مشق سخن کی حیثیت رکھتی ہیں اور باقی ماندہ میں سے بھی صرف پانچ چھ ایسی ہیں جن کی وجہ سے اس کا

نام جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ زمانے کے مذاق کے مطابق اس کے اوپیرے اطالوی ہیں

۱۷۷۸ء میں موزارٹ، الازیا ویبر کے عشق میں مبتلا ہو گیا جس سے وہ پیرس جاتے ہوئے منہائیم میں ملا تھا۔ لیکن ع

کم طالعیٔ عاشقِ جاں باز تو دیکھو

جب اس شوخِ عیارہ نے کسی دوسرے شخص سے شادی رچالی تو یہ دل بستۂ تلوّن آشنا اس کی چھوٹی بہن کانسٹینزی کی طرف مائل ہو گیا۔ جو ایک خوش گلو، خوش رُو موسیقارہ تھی۔ ۱۷۸۳ء میں دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ اس عاشقی نے جلوۂ کثرتِ اولاد دکھایا۔ لیکن سب بچے مریل پیدا ہوئے اور سوائے ایک کے بچپنے ہی میں مر گئے۔ زیادہ تر موزارٹ کے اس عجیب و غریب نظریئے کی وجہ سے کہ بچوں کو غذا کے طور پر صرف پانی دینا چاہیئے۔

نغمہ کار ہمیشہ مقروض رہا۔ اس کی مفلوک الحالی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ویران دیخ بستہ کمرے کو گرم کرنے کے لئے کوئلے اور لکڑیاں بھی مہیا نہ کر سکتا تھا۔ اور اپنی اکلوتی اُونی جرابوں میں ہاتھ لپیٹے موسیقی کی دھنیں ترتیب دینے میں لگا رہتا۔ آخر الامر پانچ دسمبر ۱۷۹۱ء کو پینتیس برس کی عمر میں وی آنا میں ٹائیفس سے مر گیا۔ بیوی ہسٹریا کی مریض تھی۔ اور دوست احباب خود غرض و بے اعتنا۔ جب وہ مرا تو اس کی تجہیز و تکفین پر کل پندرہ روپے خرچ ہوئے اور وہ بھی چندہ کر کے جمع کئے گئے۔ جنازے میں صرف چھ آدمی تھے جو بارش ہونے پر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے!

۲ ــــــــــ سیلیری ــ سالیری انطانیو۔ (۱۷۵۰ــ۱۸۲۵ء) اطالوی نغمہ نگار، جو زیادہ تر وی آنا میں رہا اور وہیں مرا۔ بیتھوون اور شوبرٹ اس کے حلقۂ

تلامذہ میں شامل رہے۔ سیلیری، ہیڈن کا جگری دوست تھا۔ اور موزارٹ کا جانی دشمن اس کے متعلق یہ (غلط) افواہ مشہور تھی۔ کہ اس نے موزارٹ کو زہر دے کر ہلاک کیا۔

۳ ——— بیتھوون لڈوگ وان (۱۷۷۰ - ۱۸۲۷ء) اطالوی کمپوزر جو موسیقاروں کے خاندانے میں بون میں پیدا ہوا۔ ۱۷۹۲ء میں وی آنا چلا گیا۔ (ہیڈن کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لئے۔ لیکن اس کے پاس ٹھہرا نہیں) اور پھر وہیں انتقال کر گیا۔ بہت رنگین مزاج اور سدا بہار پیشہ جوان تھا۔ عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا۔

۴ ——— شوبرٹ فرانز (۱۷۹۷ - ۱۸۲۸) آسٹروی کمپوزر۔ وی آنا سے کہیں باہر نہ گیا۔ مجرد رہا۔ اور آخر کار ٹائیفس کا شکار ہوا۔

۵ ——— ہیڈن جوزف (۱۷۳۲ - ۱۸۰۹) آسٹروی کمپوزر۔ ۳۱ ؍ مارچ ۱۷۳۲ء کو ہنگری اور زیریں آسٹریا کی سرحد پر واقع ایک گاؤں راہراؤ میں پیدا ہوا۔ اور آخر وی آنا میں سپرد خاک ہوا۔

۶ ——— پسنی نکولا (۱۷۲۸ - ۱۸۰۰) اطالوی کمپوزر جو ۱۶ جنوری ۱۷۲۸ء کو نیپلز میں پیدا ہوا۔ ۱۷۵۶ء میں اس نے اپنی ایک شاگرد سیبیلا سے شادی کر لی اُس نے سو سے اُوپر اوپرے لکھے۔ زیادہ تر پیرس میں مقیم رہا۔ اور وہیں سے رہگرائے عالم بقا ہوا۔ وہیں انی جینا کی پیش کش کے سلسلے میں اس کے اور گلک کے مداحوں میں دنگا

فساد ہوا۔ گلک کی انی جینیا اٹھارہ مئی ۱۷۷۹ء کو پیش ہوئی اور پسنی کی ۲۳ جنوری ۱۷۸۱ء کو پیرس کے زمانے میں اس کا بہترین کھیل ڈیڈون (۱۷۸۳ء) تھا۔ جو نصف صدی تک سٹیج پر قابض رہا۔ ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کے بعد یہ نیپلز کو لوٹ گیا۔ جہاں شاہ فرڈی ننڈ چہارم نے پہلے تو اسے مراحم خسروانہ سے نوازا۔ لیکن بعد میں اس کی بیٹی کی ایک عام شہری کے ساتھ شادی ہو جانے پر اس پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ اور یہ نو سال تک وینس، نیپلز اور رومۃ الکبریٰ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر ۱۷۹۹ء میں پیرس لوٹ آیا یعنی

پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اور وہیں ۷ مئی ۱۸۰۰ء کو انتقال کر گیا۔

۷ ——— گلک کرسٹوفر ولیبالڈ (۱۷۱۴ء - ۱۷۸۷) اطالوی کمپوزر

باویریا میں پیدا ہوا۔ سیر و سیاحت کا بہت دل دادہ تھا۔ (پیرس (۱۷۷۳-۱۷۷۹) میں اس کے مداح وابستگان پسنی سے اُلجھے۔ آخر وی آنا میں سکونت پذیر ہوا۔ اور وہیں دفن ہوا اُس نے اسٹیج کے لئے پینتالیس سے زیادہ چیزیں لکھیں۔ انقلاب فرانس کے وقت اُس نے موسیقی میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ یونانی المیہ کی باز تخلیق کی کوشش میں اوپرا بہت سی مثیر یکل اور سماجی پابندیوں میں جکڑ کر رہ گیا تھا۔ جن کا یونا۔ رومی ڈرامے سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اور جس سے اوپرا کی اسٹیج محض گانے والوں کی نمائش گاہ بن کر رہ گئی تھی۔ گائکی اگرچہ شاندار رہتی۔ مگر ڈرامائی عناصر غائب ہو گئے تھے۔ ۱۷۶۲ء میں گلک نے ارفیس اور یوریڈس پیش کر کے موجودہ اوپرا کا ڈول ڈالا۔ اور یونانی ڈرامے کی طرف مراجعت کی۔ ترجمان فطرت روسو اس کا پُر زور مداح تھا۔ بلیسٹس کی پیش کش میں اس نے عملی مدد بھی دی۔ یہ مزید ثبوت اس بات کا ہے کہ کلاسیکی اور رومانی کا تضاد بالکل بے معنی ہے

گلک اپنی جدّت طرازیوں کے متعلق کہتا ہے۔ میں نے موسیقی کو اس کے اصل مقصد کی طرف لانے کی کوشش کی۔ غیر ضروری سجاوٹ کو دُور کیا۔ جذبات کے اظہار کو شدید بنایا اور شاعری کو ثانوی درجہ دیا۔

موزارٹ بھی اس کے شاگردوں میں شامل تھا۔

۸ ——— انی جینی ——— "انی جینیا طاروس میں" یونان المیہ نگار یُوری پیڈیس کا ڈرامہ۔ جس پر متعدد دکمپوزروں نے اوپرے تحریر کیے۔

مثلاً گلک نے جو ۱۷۷۹ء میں پیرس میں پیش ہُوا۔ اور پیسنی نے جو ۱۷۸۱ء میں پیرس میں اسٹیج کیا گیا ——— "دونوں کے معتقد انبوہ در انبوہ تھے۔ جلسوں کو معرکے اور معرکوں کو ہنگامے بناتے تھے۔ مگر دونوں بزرگوں پر رحمت ہے کہ دست و گریباں نہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھی نوک جھونک ہو جاتی تھی کہ وہ قابلِ اعتنا نہیں۔"

۹ ——— ڈون ژوان ۔ موزارٹ کا اوپرا۔ جو اطالوی زبان میں پراگ میں پیش ہُوا۔ ڈون ژوان ایک رنگیلا چھیل چھبیلا ہرجائی عاشق ہے۔ جسے آخر کار ایک سنگی مہمان کیفرِ کردار کو پہنچاتا ہے۔

۱۰ ——— رافیل سانتی (۱۴۸۳ — ۱۵۲۰) اطالوی مصوّر و سنگ تراش۔ جو اربینو میں پیدا ہُوا۔ اور نشاۃ ثانیہ کے تین بڑے تخلیق کاروں میں سب سے کم عمر تھا۔ اس کا باپ بھی پینٹر تھا۔ ۱۵۰۰ء میں جب کہ رافیل کی عمر سترہ سال کی تھی۔ لیونارڈو ڈا ونچی اڑتالیس

سال کا اور میکائیل آنجلو پچیس سال کا تھا لیکن صرف دس سال کی قلیل مدت میں یہ روستا زادہ جسے ان دونوں ناموروں کی طرح فلارنس میں پیدا ہونے اور نشو ونما پانے کا اعزاز حاصل نہ تھا۔ ان کا ہمسر تسلیم کیا جانے لگا۔

۱۵۰۰ ۔ ۱۰ء کی دہائی نے نہ صرف رافیل کو ایک عظیم فن کار کی حیثیت سے اُبھرتے ہوئے دیکھا۔ بلکہ نشاۃ ثانیہ کے انتہائی عروج کا زمانہ بھی دیکھا۔ جس کی تب و تاب میں رافیل کا خون جگر بھی جھلکتا تھا۔ اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

۱۵۰۸ء کے آخر میں پوپ جولیس دوم نے اسے روم میں طلب کیا۔ اور قلعہ واٹیکان کی آرائش پر لگا دیا۔ رافیل نے روم ہی میں اپنا آخری سانس لیا۔ وہ ان انتہائی خوش نصیب فنکاروں میں سے تھا جنہیں اپنی زندگی ہی میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہو جاتی ہے۔

صاحب مرقع چغتائی اس کے متعلق لکھتا ہے:۔

"رفائیل جیسا بلند پایہ مصور۔ وہ نوجوان مصور جس نے اپنی الوہیت کی بنا پر پاپائے روم ہونے کا دعوٰے کیا تھا۔

لاورنا کو دیکھ کر لڑکھڑا جاتا ہے۔ اس کی زبان میں لکنت سی آجاتی ہے اور وہ دنیاوی اعتبار سے محض ایک کمہار کی لڑکی تھا۔ رفائیل لاورنا میں اپنی مصوری کی ابتدا اور انتہا سب کچھ دیکھتا ہے

صاحب محاسن کلام غالب "مرزا غالب کی معشوقہ مریم نہیں جو خیال غیر سے پاک اور جنس مقابل سے بالا ہے۔ بلکہ زلیخا ہے۔ وہ خود یوسف نہیں بلکہ سری کرشن ہیں۔ ان کے معشوق کی تصویر رافائیل نہیں کھینچ سکتا یہ روبنس کا کام ہے۔

۱۱ ـــــــــ لیونارڈو ڈاونچی (۱۴۵۲ ۔ ۱۵۱۹) دورِ احیا کے آفاقی

رجال کے نادرۂ روزگار گروہ کا ایک برگزیدہ فرد۔ جو ایک ہمہ جہتی نابغہ اور ہشت پہلو ہیرا تھا۔

ع بے نکاحی ماں کا نورِ چشم تھا لیونارڈو

ونچی اس کی جائے پیدائش تھی۔

مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی نے سخنہائے گفتنی۔ مرقع چغتائی میں اس کا ذکر بہت پُرلطف انداز سے کیا ہے:- لیونارڈو نے جب مونالیزا کو دیکھا جو صنفِ نازک کا صحیح معیار اور سرتاپا جذبات کا ایک ہنگامہ تھی۔ تو وہ دیوانہ وار اس مقام کے اردگرد برسوں چکر کاٹتا رہا۔ جہاں وہ دنیاوی زندگی بسر کر رہی تھی۔ لیونارڈو نے حالتِ فیضان میں مونالیزا کی معنوی خوبیوں اور گہرائیوں میں ایک ہلکا سا تبسم کھولتا ہوا دیکھا تھا جو اس کے حسن میں جھلملا رہا تھا۔ یہ اس کی مستقل مزاجی اور دیانت داری تھی کہ اس نے اسے غیر فانی بنانے میں اس قدر استقلال سے کام لیا جس کی مثال مغربی دُنیا پھر کبھی پیدا نہ کر سکی۔

لیونارڈو نے وہ شانِ رومانیت وہ نازک تاثرات جو دنیا کو دیئے وہ صرف ایک پُرکیف تبسم میں پنہاں تھے۔ وہ تبسم جس نے لیونارڈو کو گدگدایا۔ جسے لیونارڈو کسی طرح سے بھی نہ چھپا سکا مونالیزا صرف ایک آئینہ تھی۔ جس میں لیونارڈو اپنا آپ اور وہ تبسم دیکھ سکتا تھا۔ جو اُسے حالتِ فیضان میں محسوس ہوا۔ اور جس پر اس نے اپنی قوتِ متخیلہ سے ایسی گرفت پائی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس کے بس میں آ گیا۔ وہ پُراسرار راز جسے لیونارڈو اور مونالیزا ہی جانتے تھے سوائے ایک تصویر کے کوئی عریاں نہ کر سکا۔ اس وقت تک ہزاروں نقاد اور مصور روزانہ وہ راز مونالیزا سے پوچھتے ہیں اور جواب کے لئے گھنٹوں اس کے سامنے بہ عجز و نیاز مجسموں کی طرح خاموش کھڑے اس کے متبسم لبوں سے کچھ سننے کے منتظر نظر آتے ہیں۔ پر اس کے پاس انسانی تسلی کے لئے کوئی جواب نہیں۔ سوائے ایک روحانی تبسم کے جسے لیونارڈو نے مونالیزا کے قالب میں آکر

حاصل کیا تھا۔ آہ! یہ احساس کس قدر متعدی ہے کہ دنیا اس کے اس مختصر جواب سے آج تک مسرور رہے ؎

یک چراغ است دریں خانہ واز پر توِ آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

دنیا بہت کم جانتی ہے کہ لیناآرڈو نے جب موناآلزا کو اپنا موڈل چنا تھا یا وہ اپنی شبیہہ اُتروانے کی غرض سے لیناآرڈو کے سامنے بیٹھی۔ تو دونوں دلوں کے اندر کیا کیا جذبات کام کر رہے تھے۔ موناآلزا کیا چاہتی تھی۔ اور لینارڈو نے اسے کیا کچھ سمجھا تھا۔

دن اور مہینے گذر گئے۔ موناآلزا برابر موڈل بنی بیٹھی رہی۔ لیکن لیناآرڈو کا قلم ایک خط بھی نہ لگا سکا۔ لیناآرڈو کا قلم کیوں عاجز تھا؟ یہ لیناآرڈو ہی جانتا تھا۔ موناآلزا تو اپنا مشابہ خاکہ دیکھنے کی فکر میں تھی۔ اور لیناآرڈو اس سے معذور تھا۔ کیونکہ وہ ایک معنی خیز تبسم کے لئے اپنے جذبات ہاتھ سے دے چکا تھا۔ جب اس کے تصورات وہ ذہنی نقش اُتارنے سے عاری ہو چکے۔ جو اس نے حالتِ فیضان میں دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ تو اس نے موناآلزا سے ہم کلامی کی اور اسے رومان سے لبریز درد انگیز افسانے سنائے۔ اُس نے بڑے بڑے باکمال مغنی جمع کئے۔ اس کے اردگرد اگر کی بتیاں جلائیں۔ رنگارنگ کے پھولوں میں ایک خاص اہتمام پیدا کیا۔ پھر وہ ترنم خیز آواز جو لینارڈو کی روح سے پیدا ہوئی تھی۔ موناآلزا کے درد بھرے دل میں کچھ اس طرح سے لگی کہ اُس کا لذت آشنا دل جو بے آب اور زنگ آلود پڑا تھا سوزوگداز اور ولولہ انگیز جذبات سے شعلہ کی مانند بھڑک اُٹھا۔ اور وہ جو پہلے خود تماشا تھی۔ اب خود محوِ تماشا ہو گئی۔ اور اپنی شبیہہ اُتروانے کا خیال بھول گئی۔ یہ لیونارڈو کی کوشش تھی کہ اس کے دماغ سے یہ خیال محو کر دے کہ وہ اپنی شبیہہ

اُتروانے کی غرض سے اس کے سامنے موڈل بن کر بیٹھی ہے اور خود اس پر اسرار بلندی پر پہنچ جائے۔ جس کے لئے اُس نے اُسے چُنا ہے۔ بہتوں کا خیال ہے کہ لیونارڈو کا یہ قلم کار مونالیزا کی صحیح شبیہہ نہیں۔ کیونکہ وہ مونالیزا کی نہیں بلکہ خود مصوّر لیونارڈو کی تصویر ہے۔

باوجود ان کوششوں کے جو لیونارڈو اور رفائیل نے اپنے موڈلوں کو جذبات کا جامہ پہنانے میں بڑی دیانت داری سے انجام دیں۔ ایشیا کی ان خوبیوں کو جو جمالیات کی حقیقت کہلا سکتی ہیں۔ نہ پہنچ سکیں۔ رفائیل بہزاد کے نقوش کو بڑی حیرت سے دیکھتا۔ اس نے اور رمبرنٹ (۱۶۰۶ - ۶۹) نے کئی بار عجمی مصوری کی تقلید کی اور نقل میں اپنا قلم اٹھایا۔ جو ان کے شاہکاروں سے اب بھی ظاہر ہے مگر وہ موڈل کے مقلدان آزاد بلندیوں پر دیر تک سانس نہ لے سکے اور گھبرا کر پھر دنیا کے میدانوں میں آ بسے۔"

صاحبِ محاسن کلام غالب:۔ جب لیونارڈا دو ونچی سے خانقاہ ویلا گراطبا کے اسقف نے عشائے ربانی کی تصویر بنانے کے لئے کہا تو وہ کئی روز تک صبح سے شام تک اپنا موقلم ہاتھ میں لئے کھڑا رہا اور پردہ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔

۱۲ ——— دانتے آلی گیری (۱۲۶۵ - ۱۳۲۱) فلارنس میں پیدا ہوا اور جلا وطنی میں مرا ——— پیراڈائز و کا آخری کینٹو لکھنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد چودہ ستمبر ۱۳۲۱ء کو ——— جسے اس کی عظیم تصنیف "طربیۂ خداوندی" نے زندۂ جاوید بنا دیا۔ اور جس کی "روشنی سے پترارکا اور چاسر سے لے کر اقبال اور روبین رولاں تک سب مستفید ہوئے۔" اسی

تصنیف کا محرک اس کی کمسن معشوقہ بیاترچے کا ملکوتی حسن تھا۔ جسے اس نے اپنی سوانحی کتاب "حیاتِ تازہ" میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

"طربیہ خداوندی کی زبان توسکا (وسط ایطالیہ) کی زبان ہے۔ جو بعد میں معیاری اطالوی بن گئی۔ بلکہ یہ معیاری اطالوی قوت بیان میں یورپ کی ہر جدید زبان سے آگے بڑھ گئی۔

دانتے اپنے طرز کو طرزِ لطیف و نو کہا کرتا تھا۔ جس کا مقصد بلند مرتبہ، بنیادی، شائستہ، مجلسی مادری زبان کی تعمیر تھا۔ جو ہر اطالوی ریاست کے لئے موزوں ہو۔ لیکن کسی خاص ریاست کی زبان نہ ہو۔ جس میں ہر شہر کے مقامی محاورے تولے جائیں جانچے جائیں اور ان کا مقابلہ کیا جائے۔

دانتے سے اطالوی زبان کا بچپنا ختم اور دورِ شباب شروع ہوتا ہے۔ طربیہ اصل میں ایک مسیحی روح کا جہنم واعراف و فردوس کا سفر ہے۔ جس میں دانتے ایک متبحر عالم متعصب عیسائی اور بدیع و بے نظیر شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔

۱۳ ـــــــ بونارٹ ـــ مائیکل اینجلو بونا روٹی (۱۴۷۵ - ۱۵۶۴) مصور و سنگ تراش عام خیال تھا۔ کہ اس نے فن کو حقیقت سے قریب تر لانے کے لئے مسیح مصلوب کے معمول کو قتل کر دیا تھا۔

اس کا نظریۂ فن بقولِ غالب یہ تھا۔

دیدہ ور آنکہ چو نہد دل بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری!

طاقِ نسیاں

رنگ ہا چو شد فراہم مصرفے دیگر نداشت
خلد را نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کردہ ایم

پہلا مرد ———— مرینہ
دوسرا مرد ———— ہُوداویہ

(وادیِ طیبب کا ایک گوشہ، دائیں ہاتھ ایک غار۔ غار کے سامنے ایک بڑی صلیب نصب ہے بائیں سمت ریت کے ٹیلے۔ آسمان لاجورد کے پیالے کے اندرون کی طرح نیلگوں ہے۔ پہاڑیاں سُرخ ریت کی ہیں۔ اور ان پر جا بجا کانٹوں کے جھاڑ ہیں)

پہلا مرد:۔ کون ہے یہ عورت اس کو دیکھ کر
خوف سے دھڑکن ہے دل کی تیز تر؟
ہے جھلا بور ارغوانی پیرہن،
کاکلیں سونے کے تاروں کی طرح
دل مرا کہتا ہے شہزادی ہے یہ
کیوں کہ اکثر مانجھیوں سے یہ سُنا

جو پہنتی ہے قبائے قرمزی
ہے وہ بیٹی اپنے شاہنشاہ کی!

دوسرا مرد:- پر پرندوں کے ہیں اس کے نعل پر
سبز فام اس کا شلوکا خوش نما
دانۂ نو رس کی رنگت کی طرح
گدگداتی ہو جیسے بادِ بہار
دل میں دھڑکے خواہش بالیدگی!
تیر جستِ بازہ کا اندیشہ بھی
آستیں ہے یا کہ بُکاَ نورُ کا!
موتیوں کی جگمگاہٹ دیکھ کر
اس طرح لگتا ہے جیسے چاند ہیں!

پہلا:- چاند جو پانی میں آتے ہیں نظر
جب ہوا چلتی ہے سمتِ کوہ سے

دوسرا:- نو بیا کے دیس سے آتی ہوئی
وہ پری پیکر ہے کوئی اپسرا!

پہلا:- بادشہ زادی ہے یہ گج گامنی
ناخن اُس کے لال ہیں مہندی سے یوُں
لالۂ پُر خوں کی جیسے پنکھڑی
اوس میں بھیگا ہُوا برگِ گلاب

دوسرا:- اُس کے دیوی ہونے میں تو شک نہیں
پر نہ جانے اپنا ہیکل چھوڑ کر
یہ فلک پیما ہے کیوں صحرا نورد
کس کی خاطر اُس نے دھارا یہ برن
کس لئے جوگن بنی یہ گلبدن ؟
ہو مخاطب ہم سے تو چُپ سادھ لیں
پھنس نہ جائیں تا کسی جنجال میں
جو پون کی مثل ہوں خانہ بدوش
ایسے سیاحوں سے بچنا چاہیئے!

پہلا:- ہے وہ نورِ چشم شاہنشاہ کی!
مرمریں محلوں میں نازوں کی پلی
کیا پڑی اس کو مخاطب ہم سے ہو!

مرینہ:- کیا یہیں ہے گوشہ گیر اے صاحبو!
وہ حسین و نوجواں راہب کہ جو
بھاگتا ہے عورتوں کے سائے سے ؟

پہلا:- ہے اسی وادی میں وہ خلوت گزیں

مرینہ:- عورتوں سے کیوں وہ کرتا ہے گریز؟

دوسرا:- ہم بھلا کیا جانیں اس کے دل کی بات

مرینہ مجھ سے تم بھی تو چراتے ہو نگاہ

پہلا:- خیرہ کرتی ہے نگاہِ شوق کو
جوت اس موتی جڑی پوشاک کی

دوسرا:- آنکھ کو چندھیائے مہرِ نیم روز
آدمی کو تابِ نظارہ کہاں ؟
برقِ خاطف ہے تجلّیِ حُسن کی
آنکھ مند جاتی ہے فرطِ نور سے

مرینہ:۔ یہ بتاؤ ہے نشیمن کس جگہ
اس حسین و نوجواں راہب کا جو
مشتری جنسِ تمنّا کا نہیں ؟
لیٹتا ہے دامنِ کہسار میں
یا بناتا ہے بچھونا گھاس کو
نرسلوں کی جھونپڑی ہے اُس کے پاس
یا میسّر پختہ مٹّی کا مکاں ؟

پہلا:۔ سامنے کے غار میں رہتا ہے وہ

مرینہ:۔ ہے بھلا وہ بھی کوئی رہنے کی جا

پہلا:۔ پہلے اِک قنطور رہتا تھا یہاں
جوں ہی راہب اس جگہ وارد ہُوا
بلبلایا تلملایا گو بہت
جان کر لیکن تڑپنے کو فضُول
آخر کار اُس نے اپنے ، گرد وپیش
ڈالی حسرت کی نگاہِ واپسیں
اور بوجھل دل سے ٹاپیں مارتا

وسعتِ صحرا میں غائب ہو گیا

دوسرا:۔ یوں نہیں وہ تھا اِک ابیض کر گدن
دیکھتے ہی شکل راہب کی معاً
جُھک گیا گھٹنوں کے بل تعظیم سے
ہیں گواہ اس بات کے کتنے ہی لوگ
عین اس موقع پہ جو موجود تھے

پہلا:۔ ایسے لوگوں سے ملا ہوں آپ میں

مربینہ:۔ نام لیوا کن خداؤں کے ہو تم
ہے اگر تم کو عبادت کا مذاق؟
دہر میں موجود ہیں ایسے بھی لوگ
جو نہیں قائل کسی معبود کے!
لا اُبالی مشرب آزادی پسند
بندہ ہوتے شرم آتی ہے جنہیں
فلسفی جن کا نشانِ امتیاز
بھورے جتے اور لانبی ڈاڑھیاں
مشغلہ جن کا سدا بحث و نزاع

ڈیوڑھیوں میں آستینیں نہ کہے
کف بلب نیمے دروں نیمے بروں
برملا کہتے ہیں ندن لاَ اِلٰہ
واہمہ ہے ذاتِ باری کا وجود
اتفاقی ہے جہانِ ہست و بود!

پہلا:- پُوجتے ہیں سات معبُودوں کو ہم
ان کے ناموں سے ہیں گو نا آشنا
ذہن آسُودہ ہے دل ہے مطمئن
نام بتلانا ہے کھونا چین کا!
عافیت ہے جہل کے اعراف میں
حد تو یہ ہے کاہن و قسیسّ بھی!
فکر میں مشغُول اُٹھتے بیٹھتے
ذکر میں مصرُوف سوتے جاگتے
بھُول کر بھی ہونٹوں پر لاتے نہیں
ان خداؤں کے حقیقی نام کو

مرینہ:- ان خداؤں کی کہاں ہے بود و باش؟

پہلا:۔ اپنے کرتوں کی تہوں میں ہم انہیں
چشمِ عالم سے چھپائے پھرتے ہیں
ہے انہیں بے پردہ کرنے میں یہ ڈر
وہ کہیں چل دیں نہ ہم کو چھوڑ کر

مرینہ:۔ وہ ملے پہلے پہل تم کو کہاں؟

پہلا:۔ اِک محنّط نے دیئے مجھے تحفتہً
ڈھونڈھ کر اِک مدفن برباد سے
ہم نے اس انمول تحفے کے عوض
اس کو رکھّا اپنا مہماں سات سال!

مرینہ موت ہوتی ہے نہایت خوفناک
موت سے رہتی ہوں میں دہشت زدہ

پہلا:۔ موت تو لیکن نہیں ہے دیوتا!
یہ تو ان کی ایک داسی ہے فقط!

مرینہ:۔ موت ہی لیکن ہے ایسا دیوتا

جس سے آتا ہے مجھے خوف و ہراس
تم نے دیکھے ہیں بہت سے دیوتا؟

پہلا:- ہم نے دیکھا ہے بہت سوں کو مگر
رات کو اکثر وہ آتے ہیں نظر
انتہائی برق رفتاری کے ساتھ
ایک دفعہ صبح دم بھی دیکھے چند
کر رہے تھے پار جو میدان کو

مرینہ:- ایک دن بازار سے آتے ہوئے
میں نے دیکھا ایک سو فسطائی کو
کہہ رہا تھا جو کہ مجمع میں کھڑا
جس نے عرش و فرش کو پیدا کیا
ایک ہے وہ ذاتِ پاکِ کبریا!
وہ خدا ہے لاشریک و وحدہٗ

پہلا:- یہ بھلا کس طرح ہو سکتا ہے سچ
ہم کسی گنتی میں جو آتے نہیں!
بندگانِ خاکسار و کمترین!

ہم نے خود اپنی گنہگار آنکھ سے
دیوتا دیکھے ہیں رنگا رنگ کے
اور اکثر اُن کو آتے دیکھ کر!
جھاڑ جھنکاروں میں چھُپ جاتے ہیں ہم
ہیں طبیعت کے مرنجان و مرنج!
مطلقاً نقصان پہنچاتے نہیں!

مرینہ:- پھر سے چھیڑو دل نشیں انداز سے
اس حسین و نوجواں راہب کا ذکر!
وہ حسین و نوجواں راہب کہ جو
عورتوں کے رُوبرو آتا نہیں!
جس کا دل خواہش سے گرماتا نہیں
آرزو کی کش مکش سے بھاگ کر
رنگ و بُو کے پھُول بن کو تیاگ کر
لے لیا جس نے جوانی ہی میں جوگ
کاٹتا ہے کس طرح لیل و نہار؟

پھلا:- ہم تمہاری بات کو سمجھے نہیں

مرینہ:- اس حسین و نوجواں راہب کا کیا
مشغلہ ہے؟ اس کی کیا تفریح ہے؟
باغبانی کا ہے اس کو ذوق و شوق
یا پکڑتا ہے لبِ جو مچھلیاں!
راچھ پر اپنے وہ بنتا ہے کتاں
جب نکلتا ہے ستارہ صبح کا
آنکھیں ملتا چوبی ہل کو تھامتا
وہ کبھی بیلوں کے پیچھے بھی چلا؟

دوسرا:- اک مقدّس شخص ہونے کے سبب
اپنے ہاتھوں سے وہ کچھ کرتا نہیں
ہم تو ہیں عامی سے بے مایہ سے لوگ
دائماً محنت مشقّت میں جُتتے
جو بہاتے ہیں پسینہ دُھوپ میں

مرینہ:- کیا پرندے پھر کھلاتے ہیں اُسے
حصّہ بخرہ اس کو دیتے ہیں شغال؟

پہلا:- اس کے کھانے کے تو ہم ہیں ذمّہ دار

ماحضر میں اس کو کرتے ہیں شریک
بے زباں بے درد حیوان و طیور
کیسے کر سکتے ہیں اس کی دیکھ بھال؟

مرینہ:- اس سے ملتا ہے تمہیں کیا فائدہ
انتظاماتِ غذا کرتے ہو کیوں ؟
کیا ضرورت تم کو دل سوزی کرو
بخیے ٹانکو ، پیرہن دوزی کرو!

دوسرا:- وہ تو اک پہنچا ہوا مجذوب ہے
با کرامت برگزیدہ ایک بار
اس سے بد ظن ہو گیا اک دیوتا
اور ناراضی کے عالم میں اسے
کر دیا محروم عقل و ہوش سے
چندر ماں وہ دیوتا تھا غالباً

مرینہ:- جاؤ اس کو یہ مرا پیغام دو
آئی ہے عیش و طرب کے شہر سے
زائرہ اک تم سے ملنے کے لئے

پہلا:۔ وقت ہے یہ اس کی پوجا پاٹ کا
ہو نہیں سکتے خلل انداز ہم
حوصلہ ہم ہیں نہیں تعمیل کا
امتثالِ امر سے رکھیے معاف

مرینہ:۔ اس سے خائف ہو؟

پہلا:۔ ہمیں اقرار ہے

مرینہ:۔ کس لیے خائف ہو؟

پہلا:۔ کہہ سکتے نہیں!

مرینہ:۔ نام تو اس کا بتا سکتے ہو تم؟

پہلا:۔ اس سے اک آواز کرتی ہے خطاب
رات کو ہوُ دآدیہ کے نام سے!
وہ جذامی گذرے جو اس راہ سے
وہ بھی کہتے تھے اسے ہو دآدیہ

ہم بھی کچھ کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ ہے
نام اس مجذوب کا ہوڈآویہ

مرینہ:- وہ جذامی کون تھے اور اس کا وہ
نام لے کر یوں پکارے کس لئے

پہلا:- تا کہ پھیرے ان پہ وہ دستِ شفا

مرینہ:- آرزو اُن کی بر آئی کیا؟

دوسرا:- نہیں!
فعلِ بد کے وہ ہوئے تھے مرتکب
جس کی پاداش و عقوبت میں ملا
دیوتاؤں سے یہ تحفہ کوڑھ کا
ہاتھ چہرے ان کے تھے مثلِ نمک
ایک کے منہ پر کتاں کا تھا نقاب
تھا وہ شہزادہ کسی اقلیم کا

مرینہ:- کیا صدا ہے رات کے سناٹے میں

جو مسلسل گونجتی ہے غار میں ؟

پہلا:- وہ صدا کس کی ہے کیا جانیں مگر
ہم سمجھتے ہیں ندائے غیب ہے
کیونکہ ہم نے کوئی شخص اس غار میں
آتے جاتے آج تک دیکھا نہیں!

(وقفہ)

مرینہ:- باہر آؤ غار سے ہوداویہ!

ہوداویہ:- (اندر سے)
کون ہے جو نام لیتا ہے مرا ؟

مرینہ:- باہر آؤ تو بتاؤں کون ہوں!
ہے سراپا عیش میری خواب گاہ
چھت صنوبر کی منقّش آب دار
دل کشا آراستہ پیراستہ
جیسے گلشن میں عروسِ نو بہار!
مُر کی خوشبو سے معطّر بام و در

ہیں ستوں اس کے سبھی دیودار کے
پردے زنبوری، تمامی ارغواں!
سیج میری ہے گلابی رنگ کی
پائے اس کے ہیں طلائے ناب کے
سوسن و شبّو کی خوشبو میں بسے
مشعلیں مومی، مغرّق مسندیں
پردے انگوری، مشجّر گل انار!
لاتے ہیں عاشق مرے پھولوں کے ہار
نَے نوازوں، زمزمہ کاروں کے ساتھ
رات کو اکثر بنا کر ٹولیاں
سینہ چاک و دل گداز و پر فغاں
بہ ہجومِ عاشقانِ شعلہ باف
کھیلتے ہیں حال کرتے ہیں طواف
اس طلسمی خواب گاہِ ناز کا
اور لکھ جاتے ہیں فرشِ صحن پر
نور کے تڑکے گھروں کو لوٹتے
بادہ ہائے احمریں سے میرا نام
کو بہ کو، خانہ بخانہ، در بدر
جلتے ہیں پروانے شمعِ حسن کے

مشرق و مغرب ہیں افسانے مرے
کشتیوں میں خواجگانِ بحر و بر
رکھ کے لاتے ہیں زر و لعل و گہر
خسروِ ذی جاہ بازنطین کا
چھوڑ کر عشرت گہِ سنگِ سماق
سر میں سودا لے کے، دل میں اشتیاق
چل پڑا سوئے تماشا گاہِ ناز
شاہی بیڑے کے کھلے جب بادباں
تو غلاموں نے بجھا دیں مشعلیں
اس کی آمد تا کہ پوشیدہ رہے
کیا کہیں چھپتے ہیں مشک و حسن بھی؟
شاہِ قبرص تک گیا شہرہ مرا
تو پیامی بن کے نامے شوق کے
لائے سرعت سے سفیرانِ کبیر
کاروانِ رنگ و بو ہو جس طرح
لیبیا کے دو ملیکِ مقتدر
عنبرِ سارا کی سوغاتیں لئے
عاجزانہ حاضرِ خدمت ہوئے
قیصریت توڑ کر قیصر کی میں

اس سے کھیلی بے تکلف بے حجاب
یوں ہوا وہ دامِ مشکیں میں اسیر
بیٹھ کر تختِ رواں پر رات کو
بھول کر راہِ شبستانِ شہی
میرے کاشانے میں ہوتا جلوہ گر
نرگسِ شہلا سی آنکھیں چہرہ زرد!
جسم سوزِ آرزو سے انگبیں
حاکمِ گلشنآ نے اپنے جسم پر
اک مجھے محظوظ کرنے کے لئے
کوڑے مارے نوکروں کے سامنے
اور وہ پر فن شہِ ہیرا پلسؔ
جو کہ ہے قیتس بھی قزاق بھی
فرشِ پا انداز پر بے پیش و پس!
اس نے بچھوائی بساطِ لالہ گوں
تا کہ میں با نازش و تمکیں چلوں!
مخمل و باناتن کے پامال پھول
جی اُٹھے گویا خرامِ ناز سے
بیٹھتی ہوں جا کے سرکس میں کبھی
کرتب اپنے جب دکھاتے ہیں پھکیت

ایک دفعہ اک منفرد لیشی نوجواں!
ریشمیں زُلفوں کے پھندوں کا اسیر
اتفاقاً پھنس گیا پیچاک میں
میں نے مرنے کا اسے سگنل دیا
اور سب تھیٹر پکارا مرحبا!
گر گزر جمنیزیم میں ہو کبھی
اور رعنا نوجواں مصروف ہوں
دوڑ میں کشتی کے داؤ پیچ میں
کسرتی پنڈے چمکتے تیل سے
کنٹھے پیشانی پہ ہید د آس کے
پاؤں ماریں ریت پر کشتی کے وقت
اور جب دوڑیں وہ اپنے زور میں
گرد بادِ ریگ ہو دنبالہ گرد
مسکرا دوں جس جواں کو دیکھ کر
تو وہ فوراً ساتھیوں کو چھوڑ کر
میرے پیچھے نقشِ پا کو دیکھتا
آ پہنچتا ہے حریمِ ناز میں

سیر کرتی جا نکلتی ہوں کبھی

دل کشا ساحل پہ ، بندرگاہ پر
تاجروں کی دیکھتی ہوں دھوم دھام
جب جہازوں سے اُترتی ہے متاع
ساکنانِ صور کو مرغوب ہیں!
ریشمی چوغے قبائیں اطلسی،
اور آویزے زمرّد کے عزیز
لیکن اربابِ میتلا کو پسند!
بالیاں پیتل کی ، جُبّے اُدن کے
دیکھتے ہیں دُور سے میری جھلک
تو سرِ کشتی کھڑے ہو کر معًا
دینے لگتے ہیں وہ آوازیں مجھے
ہیں مگر اٹھلاتی ، ان پر ڈالتی
اک چھچلتی سی لگاوٹ کی نگاہ
ڈھانپتی ، کھلتی ، چراتی جسم کو
گات جوبن کی دکھاتی اوٹ سے
چوٹ سی دل میں لگاتی گوٹ سے
سیدھی رُخ کرتی ہوں ان مے خانوں کا
جس جگہ ملّاح پورم پوُر دن
اینڈتے ہیں دُور کرتے ہیں تکان،

دارو پی کر اور پانسے پھینک کر
جا کے شامل ان میں ہو جاتی ہوں میں
ناز سے چند لا کے کرتی ہوں کلام
تمکنت سے سب کے لیتی ہوں سلام
کیا کروں چھل بل کا الوٹ کا بیاں
جبہہ سا ہیں سرفرازانِ جہاں!
سائلِ بوسہ گدائے یک نگاہ
لے کے آتے ہیں پیالہ بھیک کا
کتنے کیواں خیمہ، گردوں بارگاہ!
میرا گھر بھی قبلۂ حاجات ہے
ہر طرف اک دل جلوں کا جمگھٹا
ہے مرے محلوں میں رنگ اڑرنگ کا
اجتماع ان میں حریر و سنگ کا
عشقِ محزوں، حسنِ شوخ و تشنگ کا
سوزِ غم، سازِ نشاط آہنگ کا
قصرِ رنگیں ہے مرا شہرِ نگار
ہے ملازم جس میں فصلِ نو بہار
گردِ صحرا کی تری زلفوں میں ہے
پاؤں زخمی ہیں خراشِ خار سے

دھوپ سے چہرہ ہے سنولایا ہوا
آؤ میرے ساتھ تم ہوداویہ!
میں تمہیں پہناؤں خزّ و پرنیاں
مشک سے نہلاؤں گورے جسم کو
گھونگریالے بال چندن سے دھوؤں
اور پھر ان میں جٹا ماسی ملوں
ریشم و سنبل کروں تم پر نثار
خوانِ الوانِ جہاں آگے دھروں
منہ میں ڈالوں چمچہ ہائے شہدِ ناب!
عشق

ہوداویہ:۔ اِک دھوکا ہے عشق کا سوا
عشق کے لائق ہے بس ذاتِ خدا

مرینہ:۔ کون ہے وہ شاہدِ مستور، عشق
جس کا ہے عشقِ مجازی سے عظیم

ہوداویہ:۔ ہے مرینہ وہ تمہارے سامنے
مریمِ عذرا کا فرزندِ جمیل!

تین دانا مرد جو تھے بادشاہ
تحفے لے کے آئے اس کے روبرو
تھے جو چرواہے جبل پر محوِ خواب
یک بیک جاگے شعاعِ نور سے
مردمانِ غیب بیں کو علم تھا
ہیکل و اشجار میں تھا تذکرہ
حضرتِ داؤدؑ نے مژدہ دیا
جس کے بارے میں نویدِ انبیا
ہیچ ہیں سب عشق اس کے سامنے
ایک ڈھلتی چھاؤں ہے حُسنِ مجاز
ہے فقط عشقِ حقیقی کو ثبات
اے مرینہ! یہ بدن ناپاک ہے
ہاں ملے گا بارگاہِ قدس سے
جسم تازہ قلب کی تطہیر سے
لازوال و لا نزو رو لا کدر!
تو کرے گی خلد زاروں میں خرام
اور جلوہ اس کا دیکھے گی مدام
جس کے گیسو ہیں سنہرے پشم کے
پاؤں پیتل کے، منزّہ، وحدہٗ

مرینہ:- حسن ؟

ہوداویہ:- حسنِ دائمی ہے رُوح کا !
زندہ رود و مائلِ نشو و نما
اور ہے معراج اس کی دیدِ حق
اس لئے اپنے گناہوں سے ثتاب
توبہ کر اے گوسفندِ ناصری
ہے یہی رازِ دوامِ زندگی !
یُوں ہی ملتے ہیں نعیمِ اخروی

(چلا جاتا ہے)

مرینہ:- وہ مخاطب تھا مگر بیگانہ وار
دیکھتا تھا کس قدر تحقیر سے
خندہ زن ذرّے پہ جیسے آفتاب
جانے کیا تھا اس رویّے کا سبب
کیا یہی شیوہ ہے اہلِ اللہ کا
اہلِ دُنیا سے وہ ملتے ہیں یُونہی؟

(وقفہ)

ہوداویہ:۔ اُٹھ گئے میری نگاہوں سے حجاب
لے چل اپنے ساتھ مجھ کو شہر میں
ہفت عصیاں کا چکھوں کا ذائقہ

مرینہ:۔ مت کرو ہوداویہ مجھ سے مذاق
دُکھ نہ دو کڑوے کسیلے بول سے
اب گناہوں سے میں توبہ کر چکی!
دامنِ صحرا میں کرنی ہوں تلاش
کوئی ایسا غار جس میں بیٹھ کر!
آرزوئے دیدِ حق دِل میں لئے
بھول کر اندیشہ ہائے این و آں
میں گزاروں یہ حیاتِ رائیگاں!

ہوداویہ:۔ شام ہوتی ہے مرینہ دیکھ بھی
دیکھ وہ سرسوں شفق کی پھول اُٹھی

کوئی الھڑ جھینپتی ہو جس طرح
عارضِ نورس پہ سُرخی شرم کی
دِن اُمنگوں کے ہیں راتیں شوق کی
کیوں گنواتی ہو انہیں ویرانے میں
آؤ مِل جُل کے بہم مستانہ وار
محفلِ عشرت میں دادِ عیش دیں

مرینہ:- میں نہ جاؤں گی وہاں اب زینہار
مقبرہ ہیں رُوح کا آبادیاں!

ہوداویہ:- تب میں ہوتا ہُوں اکیلا ہی رواں
اے مرینہ الوداع!

مرینہ:- التجا میری خدا را مان لو
بعد میں پچھتاؤ گے یہ جان لو!
(وقفہ)

مرینہ:۔ کوستی ہوں اپنے ظالم حسن کو
جس نے یوں آلودۂ عصیاں کیا
لالہ زار جسمِ مست و مرمریں
کیا پھبکتا تھا جلانے کے لئے
رات کے سینے پہ چھٹکی چاندنی!
آگ اس گھر میں لگانے کے لئے
پس رہی ہوں آسیائے رنج میں
کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
اے خدا لایا یہی پشمینہ پوش
مجھ کو تیری بارگاہِ عفو میں
اس قلندر ہی نے بتلائے مجھے
مبدا و ماویٰ کے اسرارِ نہاں
خیر و شر کے جادۂ پُر پیچ میں
تھا یہی میرا رفیق و ساربان
اے خداوندِ زمین و آسماں
نام تیرا ستّار پوش و مہرباں
سخت ہے قلب و نظر کا امتحاں
کر نہ اُس کی محنتوں کو رائیگاں!

ہوداویہ:۔ ہاتھ باندھے کیوں کھڑی ہو اس طرح
مضحکہ انگیز و جہل آمیز ہیں
سوسنی ہونٹوں کے طفلانہ سخن
جو ہُوا اس پر پشیمانی نہیں
کیا بہارِ زندگی فانی نہیں ؟
تجھ سے کرتا ہُوں مگر اتنا سوال
اے کہ یہ سرمایۂ حسن و جمال
کیوں کیا تھا تو نے اس وادی کا رُخ؟

مریم:۔ اُس خدا نے پُوچھا تھا تو جسے
اس نواحِ دشت میں بھیجا مجھے
تا کہ میں توبہ سے اپنے روسیاہ
بیسوا پن کی تلافی کر سکوں!
اور حاصل ہو مجھے دل کا سکُوں

ہوداویہ:۔ تو نے کیوں اپنے رنگیلے بول سے
اپنی متوالی نشیلی چال سے
چتونوں کے غمزۂ بے باک سے
برہنہ سینے سے، عریاں ساق سے

کُبّدیں خلخال کی آواز سے
دی مجھے ترغیبِ شوقِ ناروا!
چور دروازہ ہوس کا وا کیا؟

مرینہ:- تاکہ تیرے دل کی پیاسی خواہشیں
رُوپ میں بہروپ میں ہوں بے نقاب
پردۂ نارنج میں اُبھرے گناہ!
حرص ظاہر ہو لباسِ شرم میں!

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

خمیرِ مایۂ دوکانِ شیشہ گر سنگ است